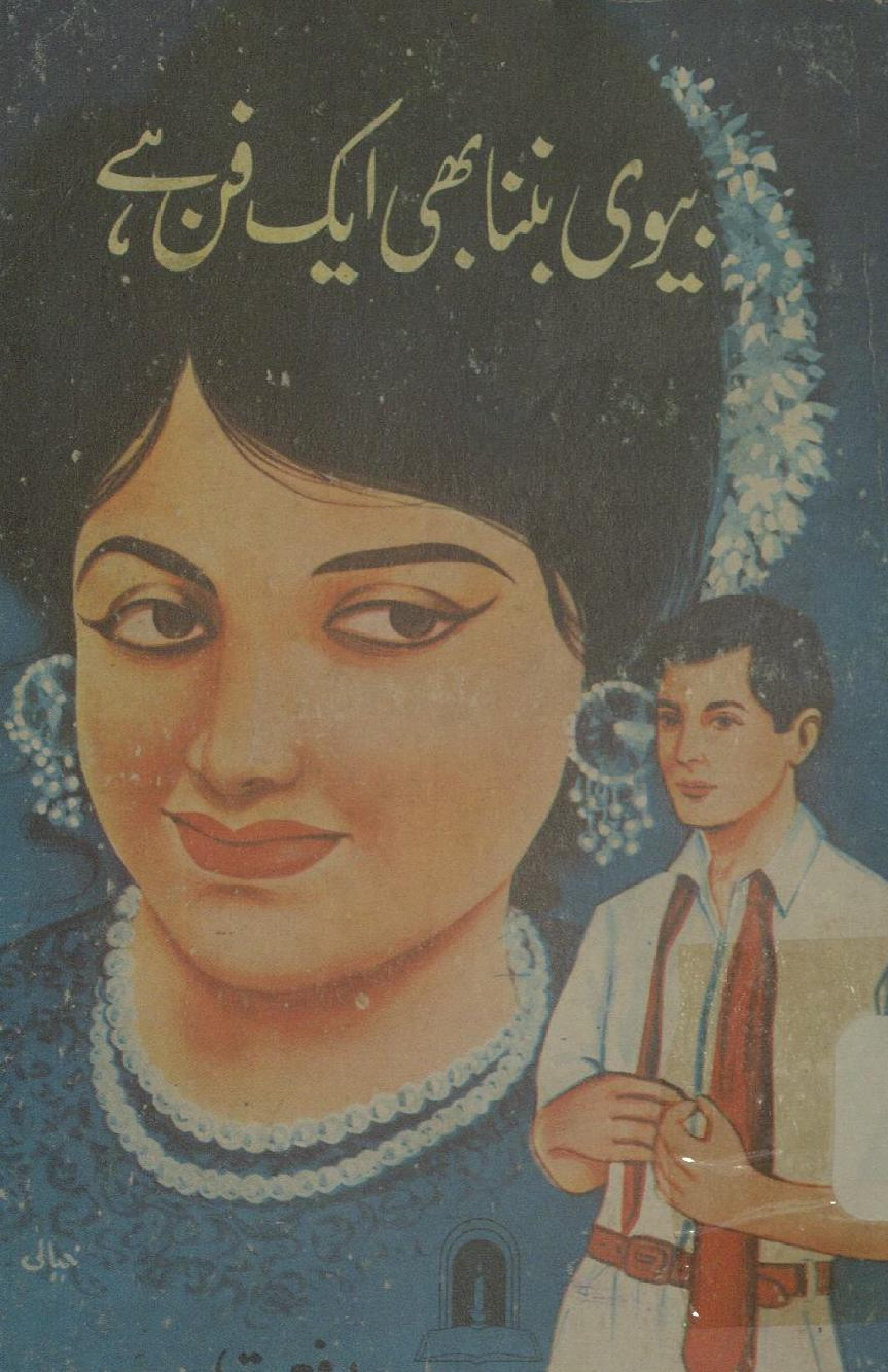

بیوی بننا بھی ایک فن ہے

ازدواجی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ

بیوی بننا بھی ایک فن ہے

رفعت

شیخ غلام علی اینڈ سنز - پبلشرز

لاہور ـــــــ حیدرآباد ـــــــ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : علمی پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت :

مقام اشاعت
شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز
ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی۔ لاہور

برسوں قبل جب ہمارا معاشرہ کسی خاص ڈگر کو نہیں اپنا سکا تھا اور مرد تعیّن نہیں کر پایا تھا کہ اپنی ملکیت میں آنے والی عورت سے کیا سلوک کرے تو ان دنوں ایک کہانی بہت مشہور تھی جو اس طرح تھی :

" خدا نے عورت کے لیے پھولوں کا نکھار، پرندوں کے نغمے، قوسِ قزح کے رنگ، نسیم صبح کی سبک روی، موجوں کی ہنسی، بکری کے بچے کی نرم دلی، لومڑی کی مکاری اور عیاری، بادلوں کی آوارگی اور کلیوں کا تلوّن بہم پہنچایا —— اور ان چیزوں کے خمیر سے عورت پیدا کر کے اسے مرد کے حوالے کیا کہ وہ اسے اپنی ساتھی اپنی بیوی بنائے - یہ آدم اپنی حوّا کو پا کر بہت خوش ہوا، اور یہ دونوں کائنات کی سیر کرنے نکل گئے مگر چند روز بعد آدم خدا کے سامنے حاضر ہوا، اور التجا کی :

" یہ عورت مجھ سے واپس لے لیجئے
میں اس کے ساتھ زندگی نہیں بسر
کر سکتا ۔"

پروردگار نے آدم کی اس التجا کو بھی شرف قبولیت بخشا - مگر تنہائی کے چند روز گزار کر آدم پھر اپنے خالق کے پاس پہنچا اور درخواست کی :

"میری بیوی مجھے واپس کر دیجیے کہ
میں اس کائنات میں اس کے بغیر
زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اللہ میاں نے اس بار بھی بظاہر غمگین و مظلوم آدم کو حوّا لوٹا دی۔
چند روز گزرے تو آدم پھر بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوا اور انتہائی
پریشان کن لہجے میں کہا :

"مالک ! اس حوّا کو اپنے ہی پاس رکھیے
میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔"

مالکِ حقیقی نے آدم کی یہ التجا بھی منظور کی اور حوّا کو واپس بلا لیا۔
آخر چوتھی بار جب آدم اپنی سنسناتی ہوئی تنہائیوں سے گھبرا کر
خدا کے پاس پہنچا اور درخواست کی کہ میں اس وسیع کائنات میں اپنی
جیون ساتھی کے بغیر چند گھڑیاں بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔
تو پروردگار نے اس شرط پر حوّا کو آدم کے ساتھ روانہ کیا کہ مرد
اور عورت، دونوں ہر حال میں دکھ سکھ سہہ کر ایک دوسرے کا سہارا
بنے رہیں گے اور ساتھ نہیں چھوڑیں گے !"

ہزاروں برس قبل کی اس کہانی پر آج بھی اس معاشرے کی آپ بیتی کا گمان
گزرتا ہے۔ اکثر گھروں میں سکون کا فقدان اس امر کا شاہد ہے کہ آج بھی آدم
کا بس چلے تو وہ خدا کے پاس جا کر اپنی حوّا کو پٹخ دے اور کہے :

"مالک ! اس حوّا کے ساتھ گزارہ
کرنا تیرے اس بندے کے بس
میں نہیں !"

مگر دوسری طرف دیکھا جائے تو ہر عورت کو اپنے تئیں یہ زعم ہے کہ :

" اس مرد سے تو بس میں ہی گزارہ کر
رہی ہوں کوئی دوسری یہاں ایک منٹ
نہیں رہ سکتی "

حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ صنفِ لطیف کو اپنے تحفظ، اپنی برتری اپنے وقار کے لیے اپنے سے برتر اور قوی ساتھی کی ضرورت ہے اور صنفِ قوی کو اپنی تمام تر برتریوں، پابندیوں، قوتوں کے باوجود ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو اس میں لچک، نسائیت اور نرم مزاجی پیدا کر سکے۔ ایک دانش ور نے اپنی اس حالت کو یوں بیان کیا ہے :

" اگر عورت نہ ہو تو میں چند دن میں
خونخوار درندہ بن جاؤں "

مرد اور عورت اس کائنات کی مشترکہ اور مساوی ضرورت ہے کیوں کہ جب کائنات پر مکمل خاموشی اور بے حسی طاری تھی :

پروردگار نے مٹی کا ایک پتلا بنایا اور اس میں روح پھونکی مگر مٹی کا یہ بُت روح کے بوجھ سے ٹوٹنے پھوٹنے لگا یعنی وہ اپنی روح پر قابو نہ رکھ سکا تو خالق نے تھوڑا سا پانی لیا اور اسے آدم کے خمیر میں داخل کیا۔ یہ پانی جو آدم میں داخل ہوا حوّا کہلایا۔ حوّا کو اپنے پہلو میں پا کر آدم کی زندگی مکمل ہوئی۔"

شادی کی اس سے مکمل کنایاتی وضاحت شاید اور کوئی نہیں یعنی مٹی پانی کو گرفت میں رکھتی ہے، پانی مٹی کو توڑ پھوڑ سے بچاتا ہے اس میں لچک اور جان پیدا کرتا ہے۔

دو صنفوں، دو ہستیوں کی جملہ صلاحیتوں کا بھرپور تعاون جو ایک دوسرے کی زندگی کو تکمیل بخشے دراصل شادی ہے۔

مگر ہمارے ہاں دیکھنے میں آیا ہے کہ یہاں شادی کے ارد گرد رسموں، رواجوں، بندھنوں کے ایسے ایسے ہالے کھینچ دیے گئے ہیں کہ شادی کا اصلی مفہوم ان میں چھپ گیا ہے۔ یہ نہیں کہ اب شادیاں نہیں ہوتیں یا آدم اور حوّا کو ایک دوسرے کا احساس نہیں مگر معاشرے کی بدقسمتی ہے کہ یہاں بڑی شان سے سہرے بھی بندھتے ہیں، پیسے بھی لٹائے جاتے ہیں، دلھن کو جملہ زیورات سے سجا کر دولھا کے گھر بھی بھیجا جاتا ہے مگر فریقین اگر کسی مد کو بھول جاتے ہیں تو وہ میاں بیوی کے باہمی اشتراک کی اساس ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کہیں آدم چاروناچار گزارہ کیے جاتا ہے کہیں حوّا اپنی تمام تر نزاکتوں سمیت بارِغم اٹھائے چلی جاتی ہے اور کہیں ہار کر آدم اپنی حوّا کو اٹھا کر میکے کی دہلیز پہ پٹخ آتا ہے اور پھر دوسری حوّا کو حاصل کر کے ایک اور غلطی کر گزرتا ہے۔

دیکھنا تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کی شدید تر ضرورت اور تڑپ کے باوجود ہمارے ہاں آدم اور حوّا آپس میں گزارہ کیوں نہیں کر سکتے۔

عموماً گھر ہستیاں اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر گلیوں، ڈیوڑھیوں، صحنوں منڈیروں، ڈرائنگ روموں اور کلبوں میں بیٹھ کر گھریلو سکون کے فقدان کا رونا روتی نظر آتی ہیں اور چھوٹے بڑے ہوٹل، ریسٹورنٹ کون سے ہیں جن کی میزوں پر ملکی سیاست سے زیادہ مردوں نے اپنی بیویوں کی نااہلی اور عدم تعاون کا رونا نہ رویا ہو۔

ایک طرف ہم ترقی کا نعرہ لگا رہے ہیں مگر بغور دیکھا جائے تو احساس ہوتا



ہے یہ معاشرہ ترقی کی دوڑ میں کیسی بھی بازی جیت لے مگر اس کے افراد کا مطالعہ کریں تو احساس ہوتا ہے ہم سب اپنے اپنے گھروں سے نالاں ہیں اور مصیبت در مصیبت یہ ہے کہ ہم پُرسکون معاشرے کی تلاش میں باہر نکل کر اور بھی معاشرتی الجھنوں میں الجھ کر اپنا سکون کھو بیٹھتے ہیں۔ جس کسی سے بھی بات کرو، وہ معاشرے کی خرابیاں گنواتے گنواتے دبی زبان سے گھریلو انتشار کا رونا بھی رو دیتا ہے ۔۔۔ گھر ہماری پناہ گاہیں یہ پُرسکون گھر لنے ہماری الجھنوں کی آماجگاہ کیوں بن گئے کہ ان کی پکار اخباری کالموں میں بحث کا موضوع بن گئی ہے۔

یہ شادی شدہ مرد، پیاری پیاری سلیقہ مند گرہستنوں کے شوہر، معصوم بچوں کے باپ، یہ اپنے اپنے گھرانوں، خاندانوں، کنبوں کے سربراہ اپنی عائلی ذمہ داریوں سے کیوں گھبرا گئے۔ انھیں ایسی کیا تکلیف ہوئی کہ وہ ہوٹلوں میں "اسپیشل چائے" کی پیالیوں میں سکون تلاش کرنے نکل آئے اور دوستوں کے حلقے میں رونا رونے لگے :

"وہ میری بیوی ضرور ہے ۔۔ میری شریکِ حیات نہیں۔"

"یار! بیوی تو آسانی سے مل جاتی ہے۔ قانونی اور شرعی لحاظ سے ایک کے بجائے چار بیویوں کی اجازت ہے ۔۔ مگر شریکِ زندگی کہاں ملتی ہے۔"

تو کیا بیوی مرد کی رفیق نہیں ہوتی ؟

مارے حیرت کے میں کچھ سوچ بھی نہ پائی۔ یہ مرد لوگ جو بیوی کی رفاقت میں زندگی کے حسین و اہم ترین ماہ و سال بسر کر چکے ہیں انھیں بھی اپنی تنہائی کا رونا ہے، اپنی اکیلی زندگی کا جلتا ہوا احساس، اس بھری دنیا میں ساتھی کی کمی کا شکوہ۔



یہ شوہروں ہی کی غلطیوں کا خمیازہ ہے یا بیوی کی صلاحیتوں کے فقدان کا سبب ؟

میں اسی کھوج میں نئے نویلے بیاہتا جوڑوں سے ملی ہوں۔

پوتوں دوہتوں والے گھرانوں کے سربراہوں سے معلومات حاصل کی ہیں کئی ایک سے باقاعدہ گھریلو زندگی کا انٹرویو لیا ہے۔ یہ جیتے جاگتے لوگ، یہ دھوکہ باز شخصیتیں، یہ محروم آرزوئیں، یہ سلگتے ہوئے روح وجسم، میں نے گھرانوں میں جلتے ہوئے احساس اور چہروں پر خشک آنسوؤں کا مشاہدہ کیا ہے اور حاصلِ مطالعہ یہ ہے۔ کہ :

"بیوی بننا بھی ایک فن ہے۔"

مگر المیہ یہ ہے کہ اکثر لڑکیوں کو شادی کی خواہش تو ہے مگر اس فن سے قطعی لاعلم ہیں، وہ شادی سے قبل بننے، سنورنے اور سجنے کے انداز تو سیکھتی چلی جاتی ہیں گھریلو ذمہ داریوں کا عملی احساس پیدا نہیں کرتیں اور خاوند تو انھیں جانے کیوں مٹی کا مادھو نظر آنے لگتا ہے کہ بس اداؤں پر نثار ہو جائے گا باقی چیزوں کی ضرورت ہی کیا۔ حالاں کہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسی ایسی عورتیں بھی مردوں کے دل و ذہن پر راج کرتی ہیں جن کے پاس نہ تو نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی سپید چمکتی رنگت ہے نہ غزالی آنکھوں کا سحر اور نہ ہی چھلکتے ہوئے ہونٹوں کے شفق رنگ پیمانے۔ جسموں میں قیامت نہ اداؤں میں شعور۔ بس معمولی سانولی رنگت، عام سے نقش ونگار،

اور میں نے ان کے قریب جا کر التجا آمیز لہجے میں پوچھا :

"تم میں کون سی صفت ہے بہن ؟"

"یہ مرد عورت سے کیا چاہتا ہے ؟"

اور!

"تمھاری کامیابی کا راز کیا ہے؟"

"راز؟" انھوں نے قہقہہ لگایا "عورت تو خود ایک سربستہ راز ہے اور مرد ایک کھلی کتاب۔ ایک مرد جو غیر عورت کی شریر مسکراہٹ پر رام ہو جاتا ہے کیا وہ بیوی کی ناز و ادا سے بھرپور خدمتوں کو چھوڑ کر کہیں جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرد ازل سے عورت کی گود میں پیار تلاش کر رہا ہے یہ اپنی ساری سختیوں، برائیوں اور صنفِ قوی کے "خطاب" کے باوجود ایک ایسی پناہ گاہ ضرور چاہتا ہے جس میں ماں کی حرارت، بہن کی شفقت، بیوی کی اطاعت اور محبوبہ کی محبت ہو۔

وہ بیوی کو اپنے سامنے گیلی مٹی کے ایک کھلونے کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے جو رنگین ہو اور آنکھوں کو بھا جائے۔ جو دل کش ہو اور روح میں سما جائے، جو ہاتھوں کو نرم لگے۔ جب چاہے اس کا روپ بگاڑ دے، اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے، توڑ لے اور بنا لے۔ مرد کو جیت لینا تو آسان ہے مگر عورت کی روح کا گھونگھٹ سرکانا مشکل ہے۔"

اور ان کی اس بات سے مجھے ایتھوپیا کی ایک لوک کہانی یاد آگئی — جو یوں ہے:

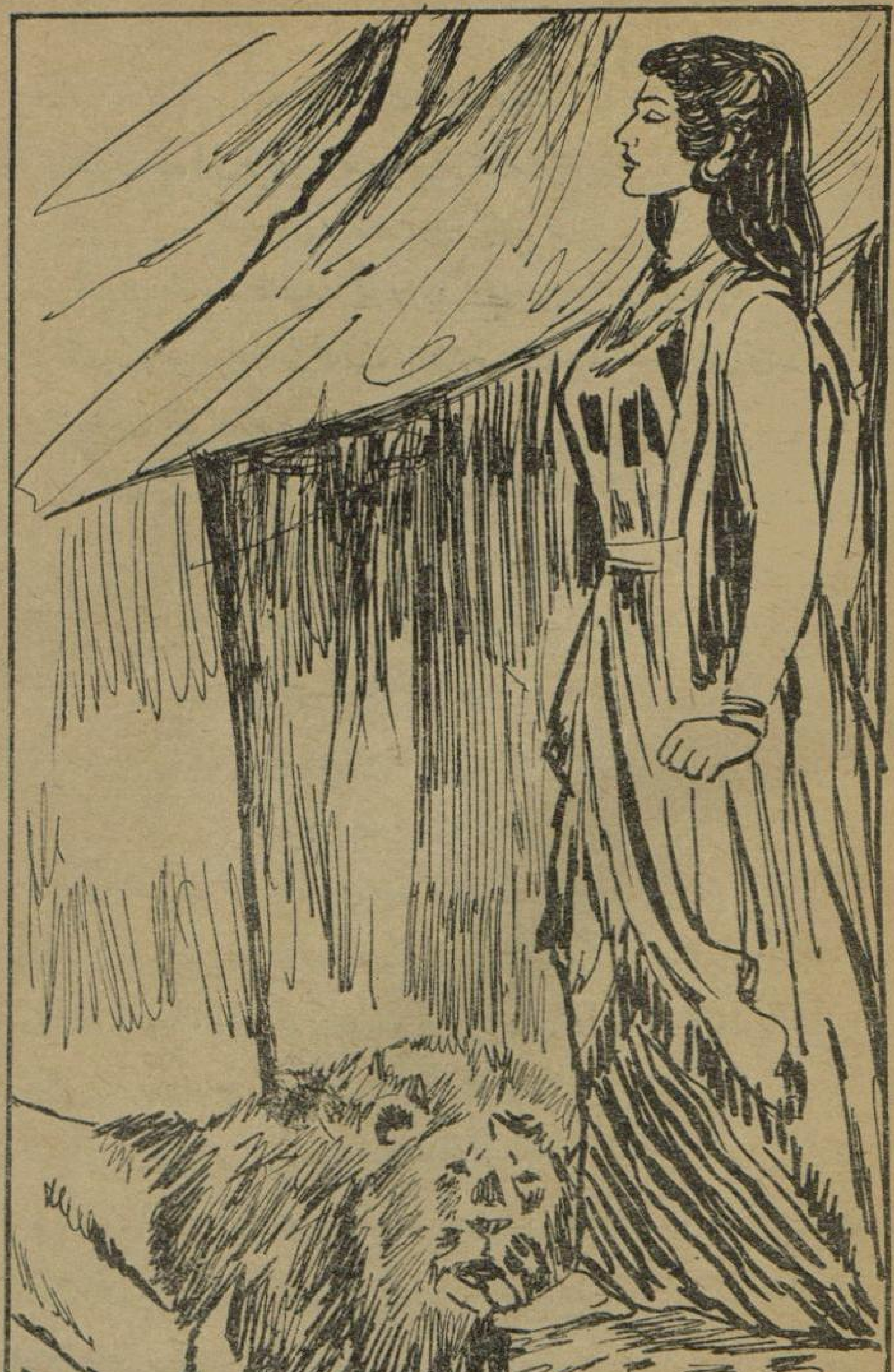
"کہتے ہیں ایک عورت اپنے شوہر کے ہاتھوں بے حد تنگ تھی کیونکہ وہ اس سے پوری طرح محبت نہیں کرتا تھا۔ عورت اپنا یہ مسئلہ ایک بزرگ کے پاس لے گئی (ظاہر ہے وہاں بھی عورتیں پیروں فقیروں سے رجوع کرتی ہوں گی) اور کہنے لگی:

"محترم کچھ ایسی بات بتا دیجیے کہ میرا
شوہر مجھے پوری طرح چاہنے لگے۔"

بزرگ نے توقف کیا اور بولے :

"تمھارا معاملہ واقعی سنگین ہے اس کے
لیے بڑا قدم اٹھانا پڑے گا، تمھیں
بھی اور مجھے بھی — وہ یہ کہ — تم
مجھے کہیں سے زندہ شیر کی گردن کے
تین بال لادو — میں ان پہ کچھ پڑھوں
گا — اور تب تمھاری منشا پوری ہو
سکتی ہے۔"

عورت واپس چلی گئی اور شیر کی گردن کے بال حاصل کرنے کا سوچنے لگی۔ اسے معلوم ہوا کہ فلاں پہاڑی کی کھوہ میں ایک شیر رہتا ہے مگر وہ شیر تک کیسے پہنچے — اس نے سوچا — اور پھر دوسری صبح وہ ایک موٹا تازہ دنبہ لے کر اسے شیر کی کھوہ پہ چھوڑ آئی اور یوں وہ چند روز بڑے تواتر سے ایک بکرا، بھیڑ یا دنبہ شیر کی کھوہ کے سامنے چھوڑ آتی رہی — رفتہ رفتہ شیر اس سے مانوس ہونے لگا اور وہ دن بھی آ گیا کہ وہ شیر کے قریب پہنچ گئی مگر شیر اس پر حملہ کرنے کے بجائے تشکّر سے دُم ہلاتا رہا اور اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ دوسرے تیسرے دن وہ اور بھی اس کے قریب چلی گئی۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس کی گردن کے تین بال لیے اور دوڑتی ہوئی بزرگ کے پاس جا پہنچی — اور قریباً چلّاتے ہوئے بولی :



"یہ لو ! شیر کی گردن کے بال ..."

بزرگ نے بال دیکھ کر تصویرِ حیرت بن کر پوچھا :

"یہ بال تم نے نوچے کیسے ؟"

تب عورت نے بڑے فاتحانہ انداز میں اپنی ساری جدوجہد سُنا ڈالی کہ کس طرح صبر، محنت، اور ہمت سے اس نے درندوں کے بادشاہ شیر کو اپنا ممنون بنا ڈالا ۔

تب بزرگ نے ہنس کر داد دینے کے انداز میں کہا :

"دیکھو بی بی ! جس طرح تم نے ایک
خونخوار اور درندے کو اپنے قبضہ
میں کیا ہے بالکل اسی لگن ، محنت
ہمت اور صبر سے تم اپنے خاوند کو
بھی اپنی طرف مائل کر سکتی ہو ۔"

اور ظاہر ہے ہمارے ہاں بہت کم عورتیں اس کہانی پر عمل کرتی ہیں ۔ حالانکہ وہ محنت اور صبر اس خاتون سے کہیں زیادہ کرتی ہیں مگر صبر کرتے ہوئے وہ شوہر سے اور بھی دور ہونے کی کوشش کرتی ہیں اور یوں اپنی مظلومیت کو ظاہر کرتے کرتے کہیں خود ظالم کا روپ دھار لیتی ہیں ۔

اکثر تو یوں بھی ہوتا ہے کہ والدین کے غلط فیصلے میاں بیوی کی زندگی تباہ کر ڈالتے ہیں گو وہی نازک موڑ بیوی کی صلاحیت آزمانے کا ہوتا ہے مگر ماحول کا بُعد اسے عجیب و غریب احساس اور کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے ۔

اسی طرح ایک خاتون ایک نیم پڑھے لکھے مگر بے ۔۔۔ کٹر مذہبی گھرانے

کی ۔ مگر سسرال اس سے قطعی برعکس تھا ۔ پوری طرح ماڈرن ، ترقی پسند شادی محض والدین کی شرافت اور گزشتہ صدی کی عزیزداری کی بنا پر کی گئی تھی۔ جو قطعی بے جوڑ اور مضحکہ خیز بھی تھی کیونکہ وہ میکے کی ڈگر پر تو ناک کی سیدھ میں آنکھیں بند کر کے بھی دوڑ سکتی تھی مگر اس ماحول میں اس نے اپنے آپ کو اس حد تک اجنبی محسوس کیا کہ خاوند کا ہاتھ بھی پیار سے نہ تھام سکی۔ میاں بے چارہ بھی ایسا میچور نہ تھا کہ بیوی کو آہستہ آہستہ اپنے ماحول سے آشنا کرتا۔

اس بے اعتمادی، جھجک اور احساسِ کمتری کے نتیجے میں دلہن چند ماہ بعد ہی میکے کی نیم تاریک کوٹھڑی میں آ بیٹھی ۔ وظیفے پڑھے، تعویذ گنڈوں میں حل تلاش کیا مگر بات وہی ڈھاک کے تین پات ۔

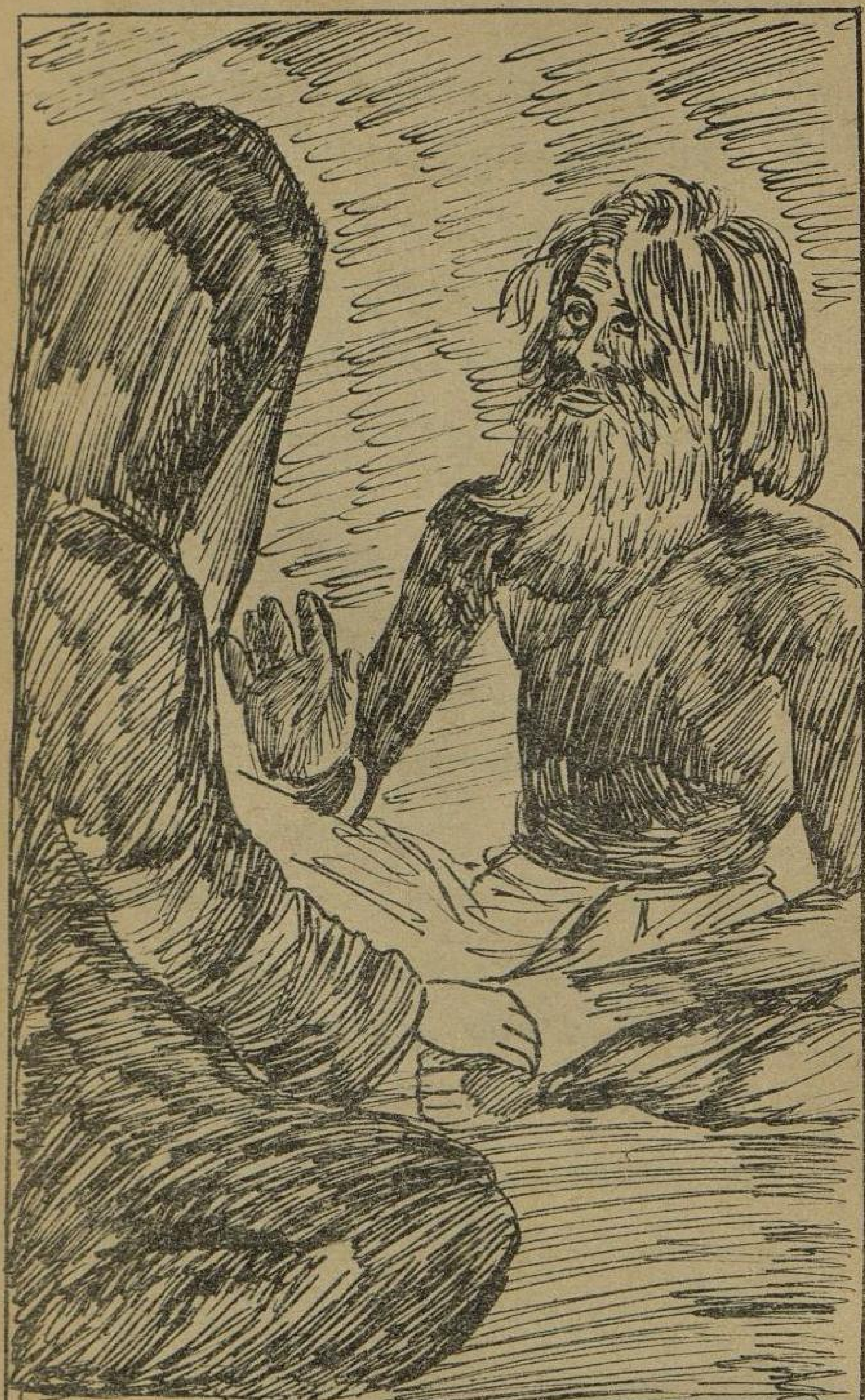
جانے کیوں مجھ سے بہت سی باتوں پر اختلاف رائے رکھتے ہوئے بھی وہ اپنی کشمکش لیے میرے پاس آ پہنچی۔

مَیں نے اسے کہا :

" بھئی اب تمھیں میکے کی روش چھوڑ کر سسرال کی ڈگر پر چلنا چاہیے کہ یہی بہتر ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کیونکہ وہ تمھیں الٹرا ماڈرن نہیں بنانا چاہتے ۔ بس وہ خود ذرا ماڈرن ہیں مگر ہیں تو مسلمان ۔ ان میں برائی کیا ہے ؟"

کہنے لگی :

" ساس، سسر، نند، خاوند، دیور، یہ سب پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں بلکہ ساس سسر تو تہجد بھی پڑھتے ہیں۔ خیرات بہت کرتے ہیں۔ تینوں کا وظیفہ بھی لگا رکھا ہے مگر



خرابی یہ ہے کہ لڑکیاں برقع نہیں اوڑھتیں اور سائیکلوں پر سکول جاتی ہیں۔ فلمیں دیکھتے ہیں۔ ایک ہی کمرے میں ٹی وی دیکھنے، ریڈیو سنتے بلکہ بہن بھائی مل کر تاش بھی کھیلتے ہیں۔ مجھے بھی برقع اتارنے پر مجبور کرتے ہیں — باورچی، مالی اور ڈرائیور کے سامنے چہرے پر گھونگھٹ بھی نہیں پھیلانے دیتے — مجھ سے یہ بے حجابی کا گناہ نہیں ہوتا !"

میں نے پوچھا :

"مگر تم جو تعویذ گنڈے کرواتی ہو۔ پیروں فقیروں سے وہاں اپنی کہانی کیا چہرے پہ نقاب ڈال کر سناتی ہو؟"

"نہیں — برقع لے کر جاتی ہوں — وہاں نقاب کہاں۔ میں تو فقیروں کے پاؤں تک دباتی ہوں۔ رو رو کر فریاد کرتی ہوں کہ وہ رحم کھا کر میرا گھر بسا دیں، میری زندگی بن جائے۔" وہ بے حد جذباتی لہجے میں سناتی رہیں۔

پھر میں نے پوچھا :

"کیا — وہاں فقیروں کے پاس جانے کی اجازت تم نے اپنے خاوند سے لی ہے ؟"

اور مزید کہا :

"کیا یہ فقیر لوگ نامحرم نہیں ہوتے جن کے پاس اکیلے میں جا کر تم ان کے پاؤں تک دبا ڈالتی ہو ؟ دیکھو بہن ! تم غیر جگہ جا کر نامحرموں سے حُب کا تعویذ اور زندگی کے

سکھ کی بھیک مانگنے کی بجائے خاوند کی بات مان لیتیں اسے اپنے گھرانے کی مذہبی روش سے آگاہ کرتیں اور یوں دو باتیں ان کی مان کر ایک بات اپنی بھی منوا لیتیں تو حرج ہی کیا تھا — بیوی پر خاوند کی اطاعت بھی تو فرض ہے۔"

چند ماہ بعد پھر جو صلح یا خلع کا جھگڑا چلا تو وہ چپکے سے خاوند کے پاس چلی گئی۔ آج وہ دو تین بچوں کی ماں ہے۔ بڑ ہانک لیتی ہے مگر ملازموں سے گھونگھٹ نہیں نکالتی۔ اس کا خیال ہے کہ شروع میں کسی عورت نے اس کے شوہر پر "کالا علم" کروا رکھا تھا اس لیے وہ اس سے دور دور رہتے تھے۔

حیرت تو یہ ہے کہ وہ اب بھی اپنے سکون کا علاج تعویذ ہی بتاتی ہے حالانکہ کالک خود اس کے اپنے ذہن سے چھٹ گئی ہے۔ اب اس میں بات کہنے کی جرأت اور کر گزرنے کا اعتماد بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ اس صدی میں زمانۂ خلافت کے مرد کو اپنا آئیڈیل بنائے ہوئے تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے آئیڈیل کی تڑپ اب بھی کبھی کبھی اس کی پُرسکون زندگی میں غم و دکھ کی لہریں ہلچل مچا دیتی ہوں۔

مگر یہ آئیڈیل — توبہ اللہ۔

بیس بائیس کے سن تک کی کنواریوں کو کچھ عجیب انتہائی رومانٹک خیالات رکھتی ہیں۔ زنانہ رسائل کے قطعی تصوراتی (حقیقت سے کوسوں دور) افسانے پڑھ پڑھ کر انھوں نے اپنے ذہن میں بڑی سجی حویلی، پائیں باغ میں سیریں، چاندنی اور فوارے کے ساتھ ایک محبوب کو ضرور جگہ دے رکھی ہوتی ہے جو بانسری کی طرح ان کے تلوے چاٹتا رہے یا پیار بھری غمگین باتیں سناتا اور سنتا رہے۔ جو حقیقت سے دور — فرار کی ایک الگ تھلگ دنیا میں رہتا ہو۔

پیار کی دھند میں لپٹی ہوئی نئی دنیا اور اس کے محبوب کا تصور جب اس تیز رفتار چیختے ہوئے معاشرے کے اقتصادی مسائل میں الجھے ہوئے خاوند سے ٹکرائے گا تو ظاہر ہے کہ رومان کا شیش محل کرچی کرچی ہو کر گھر کی دال روٹی، مرچ مصالحے میں بٹ جائے گا۔ اور اپنے خیالوں کو یوں منتشر ہوتے پا کر وہ اپنے خاوند کے گھر سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ "ابھی اور"، "کچھ اور" کی تڑپ باقی رہتی ہے اور یوں کئی بچوں کے ہوتے ہوئے طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

جانے کئی لڑکیاں یہ کیوں سمجھ لیتی ہیں کہ خاوندوں کو نخرہ دکھانا ہی ان کی ازدواجی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے اور خاوند کا پیار حاصل کرنے کے لیے انھیں رشک و حسد کی آگ میں جلانا بہت ضروری ہے۔

اسی طرح کی ایک خاتون کو مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے بیاہ کر آئیں تو انھی حربوں سے لیس۔ خاوند جس کپڑے کی تعریف کر دے وہ جواب میں فرمائیں :

"یہ تو میرے فلاں کزن کی پسند کا ہے۔"

کسی فلم کا پروگرام بنے تو کہہ دیں :

"پکچر کا مزا تو فلاں کزن کے ساتھ آتا تھا۔"

پکنک کی تیاری کی جائے تو مزے سے کہہ دیں :

"ہوں — یہ ساری جگہیں تو فلاں فلاں کزن کے ساتھ دیکھی ہیں۔"

رفتہ رفتہ کزنز کی حد درجہ تعریفیں اور بار بار ذکر شوہر کو رشک کی بجائے "گمان" کی آگ میں جھونکنے لگیں اور سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ طلاق ہو گئی۔

خاوند کو جیتنے کے لیے رقیب کا ذکر ۔ چنداں مفید نہیں ۔ اگر ایک کزن اس خاتون کا آئیڈیل تھا اور وہ خاوند کو اس کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی تو اسے کسی اور طرح اس روپ میں ڈھالتی ۔ مگر دکھ بھی تو یہی ہے کہ ہماری لڑکیوں میں ماحول سے فرار پانے کی ترکیبیں تو بہت ہیں مگر حقیقت کا سامنا کر کے اسے تسلیم کرنے کی جرأت کا فقدان ہے ۔ اور یہی بات ہمارے اکثر گھرانوں میں تنازعہ کا باعث بنتی ہے ۔

ایک صاحبہ ہیں ۔

گھرانہ تو وہی ہمارے ملک کے پینتالیس فیصد لوگوں والا ۔ مگر خود گھر سے باہر نکلیں اور سروس کرنے لگیں ۔ سروس کے دوران ہوسٹلوں میں رہیں تو اپنے گھرانے کے ماحول سے قطع تعلق کر کے ذہن کو اونچی اڑان پر لے گئیں ۔ . . . . والدین کے بتائے ہوئے رشتوں پیاموں کا تو اب سننا بھی انھیں قابلِ قبول نہ تھا ۔ سہیلیوں کی مدد سے خود ہی اپنے "پرپوزل" بھجوانے لگی اور ہوٹلوں کے کیبنوں میں یہ دکھاوے کی رسم ادا ہونے لگی ۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد ایک صاحب پسند کیے گئے جنھوں نے پہلے ہی دن اپنی ساٹھ ہزار کی کار کی چابی تھما دی اور گلبرگ کے ایک بنگلے کا نقشہ تیار کر دیا ۔

وہ شادی کی تیاری میں اپنی ہم جلیسوں کو بھی بھول گئی ۔ جب دیکھو یہ ذکر ہے :

"میری بری میں زمرّد کا سیٹ آئے گا
ڈائمنڈ کا ہم باہر جا کر خود بنوائیں
گے ۔ نکاح پر صرف ایک پلاٹینم کی
انگوٹھی آئے گی . . . . "



بیاہ کر تو وہ ایک ہوٹل کے کمرے میں گئیں۔ اور قریباً ہنی مون بھی وہاں ہی گزرا۔

شادی کے روز دولہا کو دیکھ کر سہیلیاں بے ساختہ بول اٹھیں:

"چند بچوں کا باپ لگتا ہے۔"

"اس سے دھوکا ہوا ہے۔"

"اس نے جان بوجھ کر دھوکا کھایا ہے۔"

"زیادہ پھرنے اور زیادہ کی خواہش کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

سنا ہے اب ہوٹل سے وہ اپنی رہائش گاہ میں اٹھ گئیں مگر چند روز بعد ہی لٹی پٹی سی ملیں اور کہنے لگیں:

"سنو! — بڑا ذلیل ہے۔ میرا خاوند — اس کے چار بچے ہیں اور بیوی ساتھ والی کوٹھی میں رہتی ہے — وہ اب تک مجھے دو بار مارنے آ چکی ہے — ایک دو بار اس نے میرے نوکروں کو بھی اکسایا ہے کہ مجھے ماریں — میری چوری بھی کروا دی ہے — میں تو جلد ہی اب "ڈائی وورس" لے رہی ہوں۔"

"ڈائی وورس؟"

"ہاں ہاں حرج ہی کیا ہے — اس ذلیل پر مقدمہ کروں گی اور اسے رسوا کروں گی — اس نے مجھ سے چالاکی اور عیّاری کی ہے — اور نو اور زیور بھی بیوی کا لے آیا تھا جو واپس بھی لے گیا ہے — ہوٹل کا خرچ بھی میں نے ہی دیا ہے اتنے دن کا۔"

"مگر تم نے یہ سب بے وقوفی کیوں کی؟ — تم نے شادی پر کسی بڑے سے مشورہ تو لیا ہوتا — اب اپنی سہیلیوں اور اس کے دوستوں کو

ذرا بیچ ڈال کر بات تو کرو۔"

مگر معلوم ہوا وہ سب تو نکاح کے بعد چھٹ گئے اور اب اونچی اڑان میں پر تول کر جانے والی پر کٹی چڑیا کی طرح سہمے سہمے انداز سے وہ دنیا کو دیکھ رہی ہے۔

اس نے بیوی بننے سے زیادہ ایک ایسے مرد کی شریکِ زندگی بننا چاہا تھا جو اسے کلبوں، ہوٹلوں اور پارٹیوں میں لیے لیے پھرے اور چراغِ خانہ کی بجائے شمعِ محفل بنا ڈالے۔ اسی لیے وہ اسے شمعِ محفل بنا کر آغازِ شب ہی میں تنہا چھوڑ گیا کہ باقی ماندہ —

ہنس کر گزار لے،

یا — اسے رو کر گزار دے۔

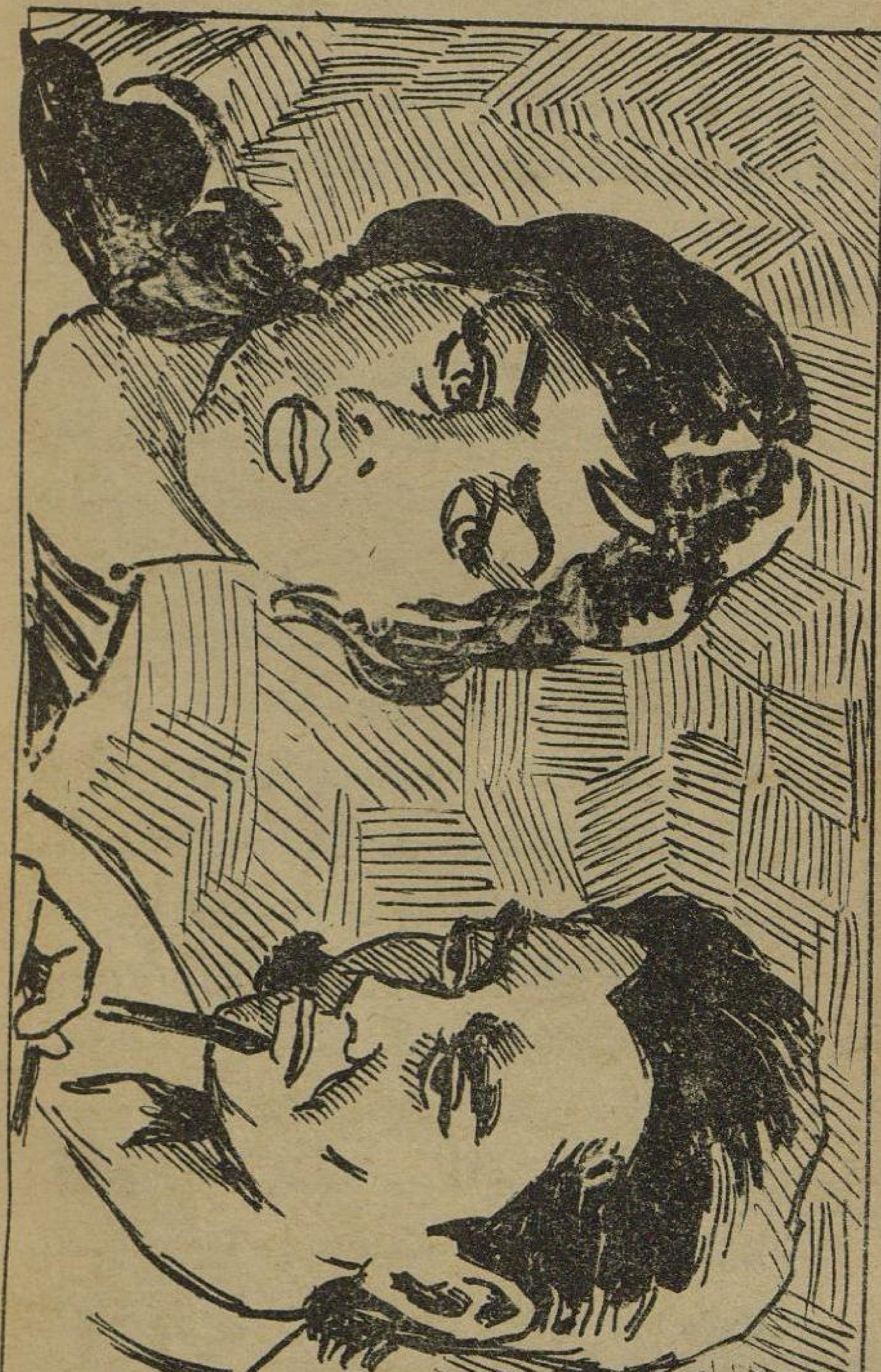
یہ ٹھیک کہ فرسودہ رسم و رواج کو ترک کر دینا چاہیے مگر ہم میں یہ کمی ہے کہ ہم اپنی روایات کو بھی فرسودہ رسم و رواج کے زمرے میں ڈال دیں اور بعد میں نقصان اٹھائیں اور اس نقصان کی تلافی کے لیے مزید غلطیاں کرتی چلی جائیں۔ اور دوش پھر بھی زمانے کو دیں اپنے آپ کو نہیں۔

اونچی اڑان کی لڑکیاں مثالی شوہروں کے لیے چاہتی ہیں:

بڑی سی کار، سجی سجائی کوٹھی کا مالک،

اچھے عہدے پر فائز۔"

مگر وہ یہ نہیں جانتیں کہ اگر وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوا تو پھر ان سب چیزوں کو حاصل کرتے کرتے اسے اپنی عمر کا بھی بڑا حصہ نذر کرنا ہوگا تب اس کی عمر بڑی ہوگی وہ خیالات کا مجبور ہو چکا ہوگا۔ اور اگر پہلے سے وہ شادی شدہ ہے تو ظاہر ہے بچوں کا باپ ہوگا ورنہ اس کے خیالات بہت پکے



ہوئے ہوں گے نوعمر لڑکی سے شاید اس کا مزاج نہ مل پائے۔ اور خیالات کا یہی اختلاف گھرانوں کے انتشار کا باعث بنتا ہے ویسے عورت سمجھ دار ہو تو ازدواجی زندگی کے بہت سے مراحل بہ آسانی طے ہو جاتے ہیں۔

بیویاں اپنے شوہروں کے ذوق و شوق کو ابھارتی بھی ہیں اور قتل بھی کرتی ہیں۔ اس زمرے میں سب سے زیادہ لوگ خود میں نے اپنی برادری میں پائے ہیں۔ یہ صحافی، یہ ادیب، شاعر، فن کار لوگ جنھیں اپنی بیویوں سے ذہنی سکون بہت کم ملا ہے وہ اپنی دوہری شخصیتوں میں ساری زندگی گزارتے ہیں۔

ایک طرف شاعر کی بیوی کو شکوہ ہے کہ

"وہ خیالی محبوبہ پر مرتے ہیں۔"

اور خاوند اس احساس میں مبتلا کہ

"بیوی میرے فن اور ذوق کی قدر کرنا
تو کجا داد بھی نہیں دیتی۔"

داد و تحسین کی یہی بھوک اسے بے قرار رکھتی اور سیدھی راہوں سے بھٹکاتی ہے۔

ایک دن میں اپنی بھابی کے ساتھ ان کی ایک سہیلی کے ہاں گئی۔ ڈرائنگ روم اور لائبریری مشترکہ تھی۔ لائبریری بڑی ہی خوب صورت اور جاندار اور دلکش کتابوں سے مزیّن تھی۔ میز پر پڑے ایک رسالے کے اترے ہوئے دیر پر سرنامہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں تو اس وقت فلاں شاعر کی لائبریری میں بیٹھی ہوں۔۔ اور میں نے دوسرے ہی لمحہ یہ تسلیم کر لیا کہ یہ لوگ سچے ہیں جو اپنے دو نام رکھتے ہیں۔ یہ شاعر حضرت بھی گھر میں جس نام سے پکارے جاتے تھے ان کے باہر کے نام سے مختلف تھا یعنی باہر وہ تخلّص سے مشہور تھے۔

مَیں اکثر گھریلو خواتین سے ملتی رہتی ہوں - گھر میں عام حالات میں وہ صبح کے وقت، بڑے سادے لباس یا بے ڈھنگے حلیے میں ملتی ہیں کیوں کہ لباس تو وہ دوپہر میں تبدیل کرتی ہیں جب کسی ہمسائی کے آنگن میں مل بیٹھنا ہو، یا شوہر کی آمد سے تھوڑی دیر قبل - کیوں کہ لباس اور جسم کی صفائی تو وہ اپنے لیے نہیں کرتیں، دوسروں کے لیے کرتی ہیں۔ اسی لیے میں ان نامور شاعر کی بیگم سے زیادہ مایوس نہیں ہوئی - وہ ایک بے ہنگم جسم کی قطعی بدسلیقہ عورت تھی - گندے، بھدّے پاؤں، تنگی شلوار، قمیص کا کوئی زاویہ بھی درست نہ تھا اور مستزاد یہ کہ قطعی ان پڑھ تھیں - ان کی ایک بات نے تو مجھے بے طرح چونکا دیا وہ ہمارے قریب ایک صوفے میں دھنس گئیں اور پاؤں ہلا ہلا کر باتیں کرتے ہوئے بولی :

"اجے او ٹٹ پینا آیا ای نئیں۔ آوندا
تے مَیں تہانوں کُج پانی نانی تے منگوا
دیندی۔"

(یعنی : خدا غارت کرے اسے وہ
ابھی تک نہیں آیا ورنہ مشروبات سے
آپ کی تواضع کرتی -)

میری بھابی نے بڑے سکون سے جواب دیا :

"فکر نہ کر - بھائی ابھی آجائیں گے - میں انھیں مل کر ہی جاؤں گی -
وہ گئے کہاں ہوں گے - آجائیں گے -"

تو وہ قدرے کرخت ہو کر بولیں :

"اسے جانا کہاں ہے بیٹھا دوستوں میں گپیں مار رہا ہو گا - آئے گا تو لے آئے گا میری سوکنیں ساتھ ہی - اور پھر لیٹ کر پڑھتا رہے گا -

میں کہوں کتابوں سے ذرا بھی نہیں اکتا تا ٹٹ پینا"۔

اور مجھ پر یوں حقیقت کھلی کہ اس سے قبل "ٹٹ پینے" کا خطاب کسی غریب ملازم کو نہیں ملا تھا بلکہ شوہرِ نامدار کی شان میں قصیدہ پڑھا گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ باورچی خانے کا چکّر لگا کر پلٹیں تو یوں گویا ہوئیں:

"لو! میں تمھارے پاس بیٹھی رہ گئی اور وہ "ٹٹ پینا" سارا ہی گوشت کھا گیا اور وہ ٹٹ پینا بھی آج اسے باہر نہیں لے کر گیا گھر ہی میں چھوڑ گیا میری جان کا عذاب"۔

اور بھابی کی مزید وضاحت پر کہ یہ محترمہ اپنے پالتو کُتّے اور شوہر کو ایک ہی ٹٹ پینے کے خطاب سے نواز رہی ہیں تو میرے ہاتھوں میں ان کی غزل والا "نقوش" لرزا اور فرش پر گر کر بکھر گیا۔

اس کے بعد میں نے جتنا چاہا کہ اس شاعر کی گھریلو زندگی کی تلخی میرے سامنے بے نقاب نہ ہو وہ اپنی وضاحتوں سے مزید کھولتی چلی گئی۔

"لو اس زمانے میں اب میں شوخ رنگ کپڑے پہنوں گی؟ وہ تو چاہتا ہے میں ہار سنگار کر کے بیٹھی رہوں مگر مجھے شرم آتی ہے کل بھی لایا تھا دو قمیضیں ٹیرون کی مگر میں نے اٹھا کر پیٹی میں ڈال دیں ــ یوں اب وہ اپنے کام خود کرنے لگ گیا ہے۔ بستر کی چادریں تکیے کے غلاف، میز پوشیں خود ہی بدل لیتا ہے۔ اس کمرے کی صفائی اور کتابوں کی جھاڑ پونچھ بھی خود کر لیتا ہے۔ میں نے کبھی دخل نہیں دیا۔ کام کرے میری جوتی ــ اور ــ اور ــ ابھی اس کی عادت نہیں گئی۔ سنا ہے پھر وہاں جاتا ہے ــ کمینیاں دوسروں کے مرد چھینتے شرم نہیں کرتیں"۔

واپسی پہ بھابی نے بڑے شکایتی لہجے میں کہا :

"دیکھا۔ یہ ہوتے ہیں مرد۔ ذرا سا مشہور ہوئے تو باہر جھانکنے لگے۔ یہ بے چاری سادہ ہے اور میاں باہر جھک مارتا ہے۔ کمینہ۔"

میں نے جھٹ سے کہا :

"بھابی جان! میں تو اب تک یہ سوچ رہی ہوں کہ ایسے مشہور، قابل، ذہین، خوش پوش، خوش اخلاق مرد نے ایسی بد وضع، بدسلیقہ اپنے سے قطعی برعکس مزاج عورت سے نبھاہ کیسے کیا ہے۔ آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ اس بیوی کو اپنے میاں کے شوق کا احترام ملحوظ ہے نہ ذوق کی خوشنودی درکار ہے۔ کیا یہ اس مرد کی ذات اور ذوق سے ظلم نہیں؟ آپ کو عورت پہ تو۔ کہ وہ آپ کی دوست ہے۔ ترس آ گیا۔ کہ میاں باہر جھک مار کر بیوی کے سکون کو برباد کرتا ہے اور پریشان رکھتا ہے مگر آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ میاں کو غلط راہ پہ ڈالنے والی خود گھر کی عورت ہی ہے اگر وہ اپنے آپ کو اپنے مرد کی پسند کے مطابق ڈھال لے تو وہ کہیں باہر نہ جائے۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ وہ شخص اس کے باوجود اپنی بیوی سے مایوس نہیں۔ اسے سنگار بناؤ کی دعوت دیتا ہے۔ اچھے

کپڑے پہننے کی فرمائش ہی نہیں کرتا بلکہ ہر کپڑا اسے
لاکر دیتا ہے۔ ان حالات میں مرد کو قصوروار کہنا۔
انصاف کا تقاضا نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی مجھے ایک صحافی یاد آگئے۔ بڑے مشہور، بڑے باوقار، جن کی زندگی کا لوہا قریباً سارا ملک مانتا ہے۔ گھر میں سلیقہ مند بیوی بھی ہے اور بچوں سے بھرا آنگن بھی۔ بظاہر ان کی زندگی بڑی بھرپور اور ہر طرح سے مکمل ہے۔ اپنا اچھا خاصا رسالہ بڑی کامیابی سے نکالتے ہیں۔ میں نے اکثر سوچا ان کے ہاں تو کسی چیز کی کمی ہی نہیں اللہ میاں نے ہر چیز پوچھے بغیر ہی دے دی ہے انھیں تو کبھی اللہ میاں سے کسی فرمائش کا موقع ہی نہیں ملا ہوگا ان کے ہاں جب بھی جانے کا اتفاق ہوا ان کی بیگم کو پہلے سے بھی زیادہ سمارٹ اور دلکش پایا۔ ہر کام بھاگ بھاگ کر کرتیں۔ شوہر کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھتیں۔

مگر ایک دو بار محفلوں میں ان صاحب کو دبی زبان سے زندگی کی بدمزگی کا گلہ کرتے پایا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکی کہ :

"محترم ! آپ کے ہاں کس کمی کا رونا ہے ؟"

دبی زبان سے بولے :

" یہ بیوی میری زندگی کا سب سے
بڑا خلا ہے۔"

" بیوی ۔؟ خلا ۔ ؟" میں مارے حیرت کے مزید پوچھ نہ سکی۔

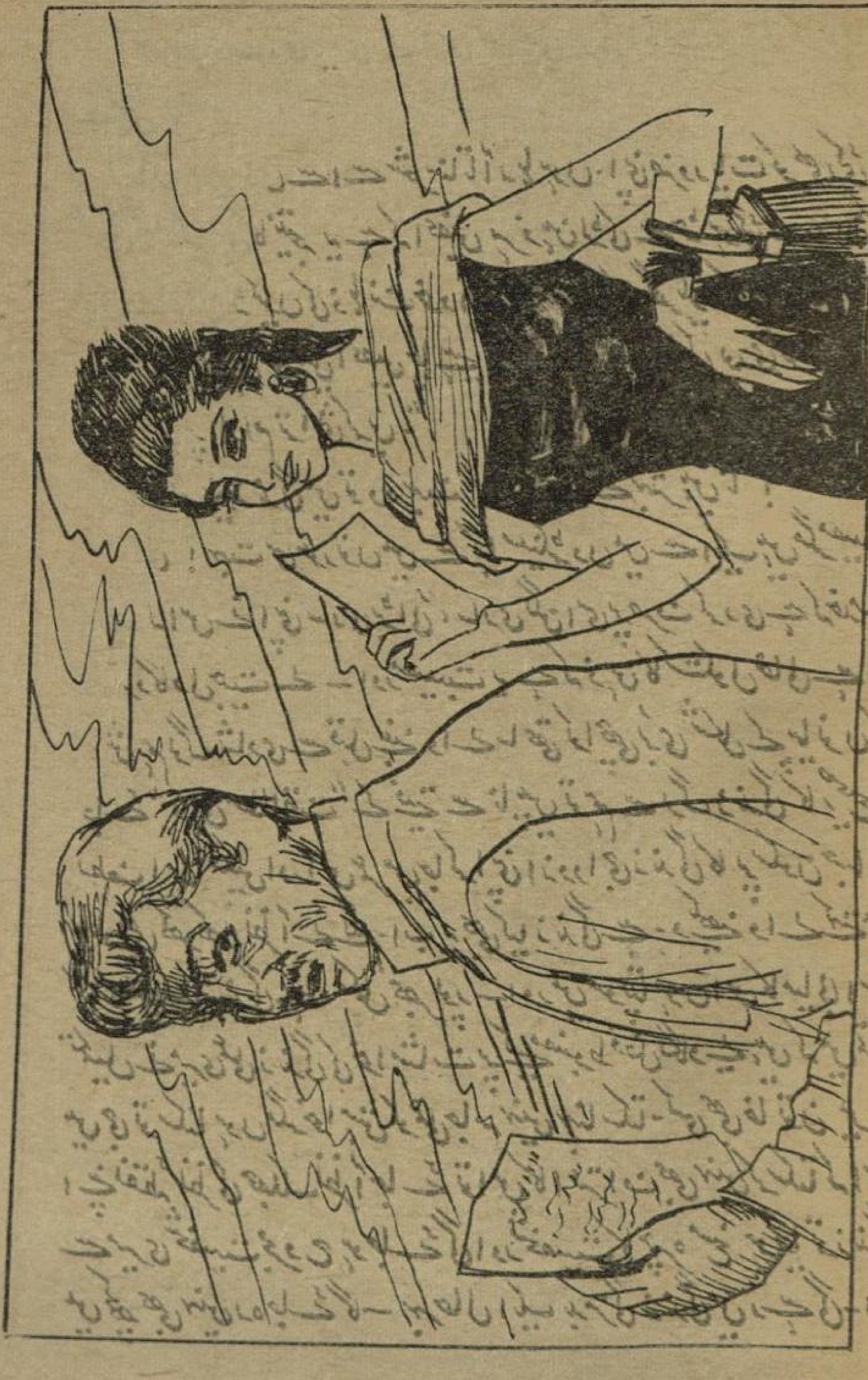
تو وہ خود ہی بولے :

" میں اکثر سوچتا ہوں، ہم بیوی کی تعریف ۔ کیا کرتے

ہیں ؟ اور زندگی کے ساتھی کی تمنّا ہمارے سینے میں کب بے چین ہوتی ہے ؟ دیکھیے رفعت ! میں صاف صاف کہہ دوں، یہ ہم لوگ جو اوائل عمر میں بیوی بیاہ لاتے ہیں در اصل اس وقت ہم اس کے ایک اہم پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں حالاں کہ

مٹی کی بھی مل جائے تو روا ہے شباب میں

اُس وقت نوجوان مرد جھک بھی مار لیتا ہے اور بیوی کو تو مرد کے جذبات کے ساتھ گزارہ کرنا ہوتا ہے۔ ہم لوگ اسے ہی منزل سمجھ لیتے ہیں۔ بیوی نین نقش کے مقابلے میں دوسروں سے بہتر ہو سمارٹ ہو (اور کوئی نہیں جانتا کہ جوانی اور شباب تو گدھی کو بھی حسین بنا دیتا ہے) پھر یہ کہ شوہر کا خیال رکھے، خدمت کرے، محبّت کرے اور دیکھیے بہن ! یہ محبّت کرنے والا خیال بھی ہم لوگوں کے ذہن کی تسلّی ہے حالاں کہ کبھی برسوں کی رفاقت سے بھی محبت پیدا نہیں ہوتی اور کبھی مارے محبت کے شادی کی زنجیر پہننی پڑتی ہے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ چودہ پندرہ برس گزار چکا ہوں۔ گھریلو زندگی میں وہ واقعی میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہے مگر پہلے تو کبھی کبھی مگر اب اکثر یہ احساس محرومی بن کر ساری زندگی پر چھا جاتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر تو میرے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہے مگر ذہنی طور پر وہ میرے ایک مضمون، ایک شعر کی بھی داد نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہیں کوئی ذہین لڑکی نظر آئے تو سوچتا ہوں یہ مرد کے لیے کتنی بڑی نعمت ہے اور پھر سچی بات یہ ہے کہ میرے اندر حسد کا ایک جذبہ ابھرتا ہے۔"



"مگر آپ نے اپنی بیوی کے ذہن میں چھپی ہوئی ذہانت کو بیدار کرنا چاہا ہے کبھی ؟"

"ہاں ! برسوں سے اسے شعر سناتا آ رہا ہوں۔ اپنی ضروریات کو بھی کئی بار گوش گزار کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں ہر ذہین لڑکی سے چڑ ہو گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان لڑکیوں کی ذہانت خود اپنی ہی صنف کے گھریلو سکون کو ڈسنی ہے۔ آپ خود ہی سوچیں انھیں چاہیے تو یہ ہے کہ وہ اپنی کمی پوری کریں نا کہ دوسروں پہ الزام تراشی کریں۔"

"مگر گھریلو زندگی میں تو وہ بہت سی عورتوں سے بہتر ہیں نا ؟"

"ہاں ! بہت سی عورتوں میں سے کیا سینکڑوں میں سے ایک ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری بڑائی، ساری لگن اسی پر صرف کر دی ہے کہ خدمت سے مرد کا دل جیت لے ۔۔ اور مصیبت یہ ہے کہ ذہن کا کشکول خالی ہے۔ کاش ہم لوگ شادی سے قبل بننے والے ساتھی کو اچھی بُری شکل کے پیمانوں کی بجائے "ذہنی مطابقت" کے فیتے سے ناپیں تو ہم سے لوگ زندگی کا صحیح لطف اٹھا سکیں اور اس عمر میں جا کر اپنی ازدواجی زندگی کا پر سکون جسمانی پہلو بھی کھوکھلا نظر آنے لگے۔ اب یہ بھی کیا زندگی ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کیا کامیاب زندگی ہے۔ مکمل بھرپور ۔۔ اور میں سوچتا ہوں اس کامیابی اس تکمیل نے میری عملی زندگی کی خواہشات پہ کیسے مضبوط قفل لگا دیے ہیں کہ میں تمنّا میں جی تو سکتا ہوں مگر خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ کسی بھی خاتون میں اپنے نقطۂ نظر کی جھلک نظر آ جائے تو اس کا اعتراف بھی نہیں کر سکتا کہ اس سے میری شخصیت مجروح ہو جائے گی اور شخصیت کا چہرہ مسخ ہو گیا تو زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔۔ بہرحال ایک بدمزگی زندگی میں رہے گی۔ اور

بعض تڑپ انسان کی زندگی کا حسن بن جاتی ہے اپنا یہی حال ہے محترمہ - ویسے اگر آپ ایک سادہ سا سوال کر دیتیں کہ :

"آپ کو کیسی بیوی پسند ہے ؟"

تو میرا جواب ہوتا :

"خوب صورت ذہن کی فطین سی لڑکی جس کی آنکھوں سے ذہانت کی کرنیں پھوٹتی ہوں اور چہرے پر ذہانت کا اعتماد دل کشی بن کر پھیلا ہو — اور — اور — میری نظر میں اپنی جگہ خود ایک بھرپور کردار ہے، اور مجھے زندگی کی تکمیل کے لیے ذہین باذوق بیوی پسند ہے - اب تو میں سوچتا ہوں میں نے آدھی زندگی گزار لی ہے اور میری ساری زندگی کا نصف بہتر نہیں رُبع بہتر ہے. کاش وہ نصف بہتر ہوتی تو آج میں زیادہ پر اعتماد زیادہ باوقار ہوتا۔"

ان صاحب کے خیالات جاننے کے بعد میں کئی بار ان کی بیگم سے ملی اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنے تئیں پُر اعتماد زندگی گزار رہی ہیں - مکمل - بھرپور — کامیاب — اور وہ عمر اور ذہنی سطح کے اس دور میں داخل ہو چکی ہیں — جہاں انسان پر سکون ہو جاتا ہے فاتح بن کر —

انھوں نے مرد کی ذات کو اپنا شعار بنا لیا ہے مگر مرد کا ذہن ان کی خدمت کے زمرے میں نہیں آتا - وہ مرد کے ذہن کو باہر اور کاروبار کی چیز سمجھتی ہیں اور ظاہر ہے کہ مرد کے بیرونی کاروبار میں بیویاں بہت کم دخل دیتی ہیں - میں اکثر سوچتی ہوں — وہ اپنے شوہر کے ذہن کو کیوں نہیں اپنی ذاتی

چیز سمجھتی نا کہ اس ضرورت کا بھی اندازہ لگا کر مرد کی تشنگی کا یہ پہلو بھی سیراب کر ڈالے۔

ایک معروف افسانہ نگار سے میں نے پوچھا :

" سنا ہے آپ اپنے سارے افسانے فلاں ہوٹل کے کیبن میں بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ آخر کیوں ؟"

کہنے لگے :

" دراصل میری بیوی بڑی ضدّی ہے۔"

" بیوی کی ضد اور آپ کی افسانہ نگاری میں کیا ربط ہے کچھ روشنی ڈالیں گے آپ ؟"

" ہاں ہاں ۔ کیوں نہیں ۔ مگر پہلے میں آپ سے ایک سوال کا جواب چاہوں گا ۔ یہ بتایئے ۔ افسانہ لکھتے ہوئے یا لکھ کر تمھارا جی بھی کڑوی کڑوی چائے پینے کو چاہا ہوگا اور تم نے اپنی اس ضرورت کو پورا بھی کیا ہوگا ؟"

" ہاں ہاں کیوں نہیں ۔ مگر آپ کا پرابلم ۔۔ ؟"

" یہی بتانے لگا ہوں ۔ میری طبیعت تلخ چائے کے لیے تڑپتی ہے ۔ اگر گھر میں بیوی سے فرمائش کر دوں تو وہ ابلتے پانی میں نمک ڈال کر بعد میں پتی اور شکر ملا دودھ ڈال دیتی ہیں ۔ اب تم ہی بتاؤ نمک اور میٹھے کا مرکّب کیا میرا موڈ نہیں آف کر ڈالتا ؟ اور پھر میں گھر سے باہر نکل آتا ہوں اور پھر کسی بھی سستے مہنگے ہوٹل کی تلخ چائے پیتا ہوں۔"

" آپ نے اپنی بیوی کو منع تو کیا ہوگا نمک ڈالنے سے ۔ اور ۔ شادی کو تو دس برس ہو لیے ہوں گے ۔ پھر ۔ ؟"

" دس ۔۔ ؟ اجی پورے چودہ برس ہو گئے ہیں تم کیا جانو ۔ اس نیک بخت

نے کبھی میری خواہش کا احترام نہیں کیا۔ میں نے اسے سزا دی ہے۔ اس سے لڑا ہوں۔ دنوں گھر میں نہیں گھسا۔ اس سے بات نہیں کی۔ مگر بے سود —
اس لیے اب میں نے گھر پر چائے ہی پینی چھوڑ دی ہے کیوں کہ میں چائے کے معاملے میں اپنا مزاج نہیں بدل سکتا۔ میری بڑی بچی بارہ برس کی ہے کبھی کبھی وہ میری پسند پر چائے بنا دے تو بے چاری زیرِ عتاب آجاتی ہے
اف بہن! چائے کے لیے میرا ذوق یہ ہے کہ وہ تلخ گہری اور گرم ہو —— مگر اس کا خیال ہے وہ پھیکے رنگ کی نیم گرم تیز نمک کی دھواں ملی ہلکی مٹھاس کی ہو۔ ویسے میرا تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ جس شخص نے عورت کے متعلق کہا تھا کہ :

"وہ ضد پر آجائے تو حکومت کو بھی
ٹھکرا دیتی ہے۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"

ان کی بیوی سے ملی تو احساس ہوا کہ انھیں اپنے شوہر کی افسانہ نگاری سے واقعی بے حد چڑ ہو چکی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ :

" انھوں نے تو کبھی مجھے توجہ کے قابل ہی نہیں جانا جہاں فالتو وقت میسر آیا کاغذ کتاب لے کر بیٹھ گئے — اب تو میں عادی ہو گئی ہوں مگر شروع میں تو یہ حالت تھی کہ جب جی چاہا ان سے بات کرنے کو — تو انھوں نے میری بات سننے کی زحمت ہی گوارا نہ کی — انھوں نے کبھی اہمیت ہی نہیں دی — یہ ٹھیک ہے کہ میں ان پڑھ

ان کاغذی کہانیوں کو پڑھ نہ سکتی تھی مگر مجھے قابلِ توجہ تو سمجھا جاتا۔ میں بھی انسان ہوں ۔ مجھے یہ کہانیاں لکھ لکھ کر جلا سکتے ہیں ۔ تو میں ۔ میں بھی تو بدلہ لے سکتی ہوں مجھے بدلہ لینے کا تو حق ہے۔"

اور مجھے ان محترمہ کی اس بات پر بے حد دکھ ہوا ۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے شوہر کو جیتنے کے لیے اس کی ایک ضرورت کو محسوس کر کے ہمہ وقت اس کے لیے تیار ہو جائے انھوں نے اس ضرورت کی اہمیت ہی سے منہ پھیر لیا ۔ جو دونوں کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا ۔

اب میاں سمجھتے ہیں کہ عورت ضدی فطرت ہے اور بیوی نازاں ہے ، کہ انتقام لے رہی ہوں ۔

یہ ٹھیک کہ شروع میں میاں نے جوان دلہن کے جذبات کا خیال نہ رکھا اور بیوی نے سمجھ لیا کہ وہ ایک ایسی مشین ہے جس کی ضرورت کا اعتراف تو شوہر کرتا ہے مگر جذبات کی قدر نہیں جانتا اور افہام و تفہیم کی اس منزل پر آن کر دونوں ہی ایک دوسرے کے جذبات و خواہشات کو مدِ نظر نہ رکھ کر اپنا اپنا فیصلہ نہ کر سکے اور یوں ادھوری اور نامکمل زندگی گزار رہے ہیں ۔ میں انھیں دیکھ کر اکثر سوچتی ہوں کہ :

ان لوگوں میں اتنی جرأت کیوں نہیں
کہ بڑھ کر ایک دوسرے کو اپنی اپنی
ضرورت سے آگاہ کر کے ایک مطمئن
اور بھرپور زندگی گزاریں مگر وہ
عجیب و غریب سمجھوتہ کر کے اپنے

اپنے راستوں پر چپ چاپ چل رہے ہیں (اپنے آپ کو
مظلوم ترین ہستیاں سمجھ کر)۔

ان کی زندگی میں کوئی حسن کوئی خوب صورتی نہیں بلکہ سکون کا وہ احساس بھی نہیں جو گھریلو زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مظلوم گردانتے ہیں دوسروں کے سامنے اپنی مظلومیت کا رونا روتے ہیں مگر ظلم کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے۔ دونوں میں جرأت کا فقدان ہے مگر احساسِ ہزیمت تیز تر۔

یہاں ایک بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ بیوی ایک بار اپنے آپ کو کمتر محسوس کرلے اور اپنی ضد سے ٹل جائے یا اپنے انتقام کے جذبے کو کہیں دُور کردے ـ مگر اسے یہ خدشے بھی ستاتے رہتے ہیں کہ وہ باہر پھرتا ہے۔ مشہور ہے لڑکیوں کے خط آتے ہیں۔ باہر ان سے ملتا ہوگا۔

یہ آجکل کی لڑکیاں کیا جانیں جسے باہر لیے بیٹھی ہیں گھر میں دل جلی بیوی اور ان اتنے سارے بچوں والے گھرانے کا سربراہ ہے توبہ — !

میں سوچتی ہوں ہماری بڑی بوڑھیاں جو کہا کرتی تھیں کہ شوہر ہوٹلوں کے کیسے کیسے پکوان کھالے پلٹ کر گھر ہی آتا ہے اور پھر جو مزا بیوی کے پرخلوص ہاتھوں سے تیار کردہ کھانوں میں ہے وہ ہوٹلوں میں کہاں۔ بلکہ شوہر کو دام کرنے کا تیر بہدف نسخہ ہے کہ شوہر کے دل کا راستہ اس کے پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔

جانے ان محترمہ کے گھر میں کوئی بڑی بوڑھی نہ تھی جو انھیں یہ نسخہ بتاتی اور اگر سن رکھا ہے تو آج تک آزمایا کیوں نہیں !

کاش وہ آزما لیتیں تو آج گھر کا ماحول یقیناً کچھ
اور ہوتا !



میں نے ایک اور صحافی کی بیوی سے پوچھا :
" لوگ کہتے ہیں" صحافت" بیوی کی سوکن ہوتی ہے - آپ نے اسے کہاں تک محسوس کیا ؟"
وہ مسکرائیں اور بولیں :
" آپ نے وہ واقعہ ضرور سنا ہوگا کہ ایک خاتون نے ایک نابینا لاوارث لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دی - اس کی آنکھوں کا اپریشن کروایا اور اس کی بینائی لوٹ آئی - وہ خاتون بے اولاد تھیں اس لیے انھوں نے اس لاوارث لڑکی کی شادی اپنے میاں سے کر دی - اب ان کے آنگن میں بچوں کا شور ہے اور دیواروں پہ بچوں کی بنائی ہوئی لکیریں —— جب خواتین بڑی بیگم سے پوچھا کرتی ہیں :
"اے ہے - بڑا جگرا ہے تیرا ، سوکن کے ساتھ گزار رہی ہو"
تو وہ ہنس کر کہتی ہے " سوکن کہاں - وہ تو خود میری پروردہ ہے - مجھے بچوں کا شوق تھا اس نے پورا کر دیا - میرے گھر کی رونق بن گئی - میرا میاں مطمئن ہے - مجھے اور کیا چاہیے "
تو بہن ! میں نے بھی اس سوکن کو خود پالا ہے اور اپنے گلے کا ہار بنایا ہے اس لیے یہ میری سوکن نہیں -
بات یہ ہے !"
انھوں نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا :

"جب ہماری شادی ہوئی تو میاں کالج کے "فول" تھے فسٹ ایر کا لڑکا کیا ہوتا ہے۔ میں ذرا بڑی تک چڑھی لڑکی تھی۔ امیر والدین کی لاڈلی۔ میرا خیال تھا شادی کا مقصد سج سجا کر بیٹھنا اور خوب صورت کپڑے بے شمار زیورات پہن کر عزیزوں میں بیٹھنا اٹھنا تھا۔ میاں کو تو میں خاطر میں نہ لاتی کہ میں جانتی تھی میری ایک اپنی علیحدہ شخصیت ہے مگر ایک دن میرے والد صاحب نے یہ بات نوٹ کرلی۔ وہ خاصے جہاں دیدہ انسان ہیں انھوں نے مجھے بلایا اور سمجھایا کہ بیوی کے کیا حقوق ہوتے ہیں اور بیوی اپنے خاوند سے دُور رہ کر اپنی شخصیت نہیں بنا سکتی۔ چنانچہ اس روز سے میں نے ان کی عزت کرنا شروع کی۔ ان سے ان کی تعلیم کے بارے میں باتیں کرتی۔ ان سے شغل پوچھتی۔ رفتہ رفتہ بڑھتی عمر کے ساتھ مجھے احساس ہوگیا کہ میرا خاوند لکھنے لکھانے میں خوش رہتا ہے تو میں نے ضدی لڑکیوں کی طرح سوچ لیا کہ میاں کا شوق پورا کرکے رہوں گی۔

اب دیکھ لیجیے ــ میرا بڑا بیٹا خیر سے میٹرک کرچکا ہے امسال ــ لڑکی ساتویں میں ہے کتنا زمانہ میں نے ان کے ساتھ گزارا ہے ـــ اس دوران میرے میاں بیکار بھی رہے ہیں، دنیا سے اکتائے بھی ہیں۔ نامساعد حالات کا رونا بھی روتے رہے ہیں مگر میں اپنے ارادے پہ اٹل رہی ہوں۔"

"جی ہاں! آپ کے امیر والدین آپ کو احساس نہ ہونے دیتے ہوں گے میاں کی

بیکاری کا۔" میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

"یہ بات نہیں رفعت بہن! یہ بھی تو آپ سوچیے۔ ضدی اور اٹل ارادے کی لڑکیاں یہ کب چاہتی ہیں کہ ان کی حقیقت دوسروں پر کھل جائے۔ اس لیے میں نے صبر اور ہمت سے وقت گزارا۔ جب ان کی ہمت ٹوٹتی۔ میں سہارا دیتی اور اب وہ دیکھ لو! کامیاب ہیں۔"

"کیا آپ کو ان کی کسی عادت یا برائی سے نفرت پیدا ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری بات سنیے۔ ازدواجی زندگی کی کامیابی کا راز ——
"باہمی اعتماد" میں ہے۔ مجھے اپنے میاں پر اعتماد ہے اس لیے کئی بار جب ان کے دوستوں کی طرف سے مجھے یہ اشارہ دیا گیا کہ فلاں لڑکی ان کی طرف مائل ہے۔ تو میں نے خود اپنے اندر جھانک کر دیکھا کہیں میرا اعتماد تو مجروح نہیں ہوا۔ مگر میں دیکھتی ہوں میرا اعتماد اٹل اور پائیدار ہے تو میں کہتی ہوں کہ دنیا تو ایسے ہی کہتی ہے۔ میرا سکون لوٹنا چاہتی ہے۔ مگر میں کبھی اپنا سکون برباد نہ کروں گی۔ اس لیے میرے گھر میں لڑائی جھگڑے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ان کی ایک عادت بُری بھی ہے، ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ بدل جائے۔ وہ ہے۔ ڈرنک کرنا۔ میں جانتی ہوں یہ کرتے ہیں۔ ایک دو بار میں نے باز پرس کی تو انھوں نے کہا:

"میں کام کی زیادتی کی تھکن دور کرتا ہوں یا کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں پی لیتا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے کبھی نفرت نہیں کی ۔۔ بھئی میں سوچتی ہوں ڈرنک کرتا ہے تو چپ چاپ کمرے میں بند پڑا رہتا ہے ۔۔ وہ میرے بجٹ پر اس کا بوجھ نہیں ڈالتا ۔ مجھ سے لڑتا جھگڑتا نہیں ۔۔ اگر اس کی تھکن اتر جائے یا اعصاب کو سکون ملے۔ تو حرج ہی کیا ہے ۔ ہم بیویاں اپنی جدید مصروفیات میں اس حد تک الجھ گئی ہیں کہ خاوندوں کو دبانے اور سروں میں تیل رچانے کا وقت ہی نہیں ملتا اور وہ ہم سے لڑنے کی بجائے اپنا علاج خود کر لیتا ہے تو کیا حرج ہے ۔ ویسے اپنے طور پر دعا ضرور کرتی ہوں کہ ان کی یہ عادت چھوٹ جائے تاکہ ان میں کوئی بھی برائی باقی نہ رہے ۔ وہ میرے لیے قابلِ فخر خاوند ہو اور میں ان کی آئیڈیل ثابت ہو سکوں ۔۔ ہمیں ایک دوسرے پر جتنا اعتماد ہے اللہ کرے وہ ہمیشہ اسی طرح رہے کامیاب و کامران ۔۔ ہماری زندگی کی طرح ۔۔"

عام خیال ہے کہ مرد اچھی شکل و صورت کی بیوی پسند کرتا ہے اس زمرے میں ہمارے ادیب و شاعر زیادہ ہی بدنام ہیں ۔ مگر بڑی عجیب بات تو یہ ہے کہ میں نے وہ خواتین بھی دیکھی ہیں جو بڑی خوش شکل اور حقیقت میں "شاعر کا تخیل" نظر آتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں شاعر کی بیوی ہونے کا بھی شرف حاصل ہے ۔ مگر جب ازدواجی زندگی کے بارے میں پوچھا تو جواب میں ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ڈھلک آئے ۔

اسی سلسلہ میں ایک شاعر سے ملی اور پوچھا :

" آپ کی بیوی خوش شکل بھی ہے اور تعلیم یافتہ بھی ۔۔ پھر آپ دونوں میں یہ ذہنی

فاصلہ کیوں ؟"

وہ دکھ سے بولے :

"یہ مجھے شاعر تسلیم ہی کہاں کرتی ہیں انھیں میرے ادب سے نفرت ہے بلکہ سچ پوچھو تو یہ سمجھتی ہیں کہ :

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوّری"

"مگر کبھی آپ نے کوئی نظم ان پر بھی کہی ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"ان کی بدمزاجی پہ چند شعر ہوئے تھے - بلکہ اکثر ہو جاتے ہیں -"

"آپ نے انھیں سنائے ؟"

"ہاں — زندگی کی محرومیوں پہ جتنے بھی شعر ہوئے ہیں ان میں یہ اپنا عکس پہچان سکتی ہیں -"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے محترم — آپ چند تعریفی شعر کہہ دیتے اور شروع دن ہی بیگم کو سنا دیتے اور کہتے کہ یہ تمھارے لیے لکھے ہیں اور اس کے بعد....."

انھوں نے میری بات ٹوک کر کہا :

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا کہ وہ ادب کو پسند ہی نہیں کرتیں ان کا خیال ہے کہ میں شاعری کرنے کی بجائے جنرل مرچنٹ کی دکان کھول لیتا تو زیادہ موڈرن ہوتا - شاعری تو قطعی دقیانوسی چیز ہے ان کی نظر میں -"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھیّا — کیوں کہ میرے خیال میں ہمارے ہاں چند افراد اس معاملے میں انتہائی خوش نصیب ہیں جنھیں بڑی خوشی سے ہر کنواری لڑکی اپنے ذہن میں جگہ دے دیتی ہے - ڈاکٹر — شاعر — کرکٹر — اور ڈیبیٹر



۔ زنانہ رسائل کے کسی بھی رومانٹک افسانے کو پڑھ لیجیے ۔ ہر ہیرو میں یہی صفات پائی جاتی ہیں ۔ اور آپ ہیں کہ ہیرو ہو کر بیوی کی عدم توجہی کا رونا رو رہے ہیں ۔"

" دکھ بھی تو یہی ہے باہر میں ہیرو تسلیم کر لیا گیا ہوں مگر گھر میں بجائے میری طرف توجہ بڑھانے کے اُلٹا مجھ سے بدلہ لیا جاتا ہے ۔ میری شاعری کو کوسنے کے علاوہ مجھے ان خواتین کی خوش نصیبی کی داستانیں طعنہ سمجھ کر سننے پر مجبور کیا جاتا ہے جن کے خاوند سی ایس پی تو نہیں مان لیجیے اوورسیئر ہے مگر کار رکھی ہوئی ہے ۔ زیادہ پڑھا لکھا نہیں مگر بیوی کو خوش رکھنے کا گُر جانتا ہے ۔ اور میں حیران ہوں کہ میں کونسا طریقہ آزماؤں ۔ کس طرح بیوی کو خوش رکھوں ؟ ۔ بلکہ میں تو آپ سے کہوں گا کہ میری کچھ مدد کیجیے ۔ اس سلسلے میں ۔"

" آپ اپنی بیوی کو کبھی پکچر لے جاتے ہیں ؟"

" ہاں ! جب وہ فرمائش کریں اور میری جیب اجازت دے دے !"

" آپ نے انھیں کوئی تحفہ لا کر دیا ہے کبھی ؟"

" تحفہ ۔ ؟ کمال کرتی ہیں آپ بھی ۔ ارے بھئی میں اپنی ساری تنخواہ تو انھیں ہی دے دیتا ہوں ۔ اور مزا تو یہ ہے کہ اس کے باوجود مجھ پر شک کرتی ہیں کہ میں باہر عیاشی کرتا ہوں ۔ معاف کیجیے مجھے لگتا ہے کہ آپ بھی ان کی ہم خیال

ہیں کہ انھیں تحفوں سے نوازتا پھروں ۔ بیوی نہ ہوئی،
گرل فرینڈ ہوگئی۔"

"جی ۔ ہاں ۔ خاوند اسی غلط فہمی میں تو بیوی کا خلوص بھی کھو دیتا ہے ۔ بیوی کو یہی دکھ تو ہوتا ہے کہ مرد "گرل فرینڈ" کی منہ مانگی فرمائش پوری کر دیتا ہے مگر بیوی کی ضرورت کا بھی احساس نہیں کرتا ۔ دیکھیے بھیا اگر آپ کی بیوی یہ شک کرتی ہے کہ آپ باہر عیاشی کرتے ہیں تو وہ ٹھیک کہتی ہے اور آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ آپ گھر سے باہر رہ کر زیادہ ذہنی سکون محسوس کرتے ہیں اور یہی آپ کی عیاشی ہے ۔ آپ کی بیگم کا خیال ہے کہ اگر آپ باہر بھوک محسوس کریں تو گھر کا دال دلیا ہی غنیمت جانیں مگر آپ پہروں گھر سے غائب رہتے ہیں ۔ گھر میں داخل ہوتے ہیں تو گنگناتے ہوئے اور پھر آپ اپنے دونوں بچوں سے پیار کرنے لگتے ہیں ۔ اس وقت وہ سوچتی ہیں کہ آپ کی نظر میں بیوی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جسے اہمیت نہ بھی دو تو بھی گزر ہو جاتی ہے تب وہ آپ کے اور اپنے درمیان آپ کی شاعری کو ایک ایسی خلیج کے روپ میں محسوس کرتی ہے جو ہر لحظہ آپ کو اس سے دور کرتی جا رہی ہے ۔ مستزاد یہ کہ آپ اپنی بیوی کو بات بھی سنائیں گے تو ضرور ایسی جس میں تذکرہ ہوگا :

"فلاں شخص نے میرا فلاں شعر بہت پسند کیا ۔"

"فلاں آج اچانک ملا اور کہنے لگا ۔ وہ ۔ وہ شعر تمھارا ہے ۔ ایمان سے داد نہیں دے سکتا ۔"

"فلاں محفل میں لڑکیاں آگئیں اور آٹوگراف بک پر میرے پسندیدہ اشعار لکھنے کی فرمائش کرنے لگیں ۔"

ظاہر ہے ایسی باتیں بیگم کو سنانے سے آپ کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ

آپ کی بڑائی کا اعتراف کرے مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ خالی ہاتھ گھر جاتے ہیں آپ نے گھر آتے ہوئے کبھی نہیں سوچا کہ آپ کی بیگم آپ سے یہ توقع لگائے بیٹھی ہے۔ وہ زمانہ رسائل کے رومانٹک افسانے پڑھ پڑھ کر شاعر کی محبوبہ کے روپ میں آنا چاہتی تھی۔ قدرت نے اسے بیوی بنا دیا۔ اب وہ چاہتی ہے کہ آپ کا طرزِ عمل کبھی کبھی تو ایسا ہو خصوصاً جب آپ مشاعرے سے پلٹیں، یا اپنی بے انتہا تعریفیں سن کر۔ کہ آپ اعتراف کریں کہ :

"میرے شعروں کا رنگ تو دراصل تُو ہے
۔ میرے کلام کی جان تیری ہی شخصیت ہے"
۔۔۔۔ اس کا اعتراف یہ شعر ہی نہیں
یہ بروکیڈ کی قمیض بھی ہے، جو میں
مشاعرے کے پیسے ملتے ہی خرید لایا
ہوں۔"

تو یقین کیجیے کہ آپ کے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہوتا۔ حیرت ہوتی ہے جب آپ ایسے نازک خیال لوگ بھی رشتوں کی نزاکت کا احساس نہ کر پائیں اور عورت کو سمجھنے میں غلطی کر دیں۔

یاد رکھیے !

عورت کو جیتنے کے لیے تو سلطنتوں کی بازی لگا دی جاتی ہے۔ عورت کا دل اور ذہن جیتنا ہو تو اسے بالوں میں لگانے کو چاندی کی پنیں ہی کیوں نہ لا دیں ۔ یا ۔ ایک لپ اسٹک ۔ اس کا چہرہ تمتمائے گا اور نس نس میں مچلتا خون جیسے اسے یہ نوید دے گا ۔ کہ انھیں میرا کتنا خیال ہے ۔ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں !

ہاں۔ مگر عورت کو بھی ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ وہ ذہن کو چٹان نہ بنائے اور اپنی غلط فہمی کو محرومی کا باب نہ بنا بیٹھے۔ آپ کی یہ غلطی کہ آپ نے اپنی بیوی کو حد درجہ چاہت جس میں عاشقی کا رنگ ہو کا یقین نہیں دلایا اور بیوی کا یہ قصور کہ وہ تخیل کی اڑان میں بیوی کے درجے سے کہیں اور سرک گئی اور اس حال میں جب اس نے کبھی اپنے آپ کو بیوی محسوس بھی کیا تو ایک محرومی کے احساس کے ساتھ۔ جو آپ دونوں کو قریب کرنے کی بجائے دور لے گیا اور اب آپ کو دُوری کی یہ خلیج پاٹنے کے لیے بیوی کی طرف خود ہی مائل ہونا پڑے گا۔

یوں یہ بات یاد رکھیں کہ !

اس وقت اگر آپ اس کی طرف دو قدم بھی چل لیں گے تو وہ دس قدم بڑھ آئے گی۔ اور۔ ابھی عمر ہے کہ آپ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کر کے اپنے گھر کو پُر سکون بنا لیں کہ گھر کا پُر سکون ہونا اس دنیا کی جنّت ہے۔ آپ تو شاعر ہیں۔ جنت کو بنانے اور اس کے مزے لوٹنے کے کیسے کیسے خواب نہیں دیکھتے اپنے تصوّر میں۔ تو پھر گھر ہی سے عمل کیوں نہیں کر لیتے"۔

مگر میں نے ایک اور شاعر کی بیوی سے پوچھا :

" بھئی تم اس درجہ بنی سنوری کیوں رہتی ہو ؟ تمھارے میاں تو بہت ہی سادگی پسند ہیں"۔

وہ ہنسی اور بولیں :

" تم غلط سمجھتی ہو۔ وہ سادگی پسند نہیں۔ اگر وہ سادگی کو پسند کرتا تو مجھے گنوار ہونے کے طعنے نہ دیتا۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں ان کی پسند سے کیا ہے"۔

"ان کی پسند !"

یہ تیسرے درجے کی عورتوں والا میک اپ' بھڑکیلے کپڑے۔ میں کیسے یقین کر لوں میرے خدا ! کہ یہ سب کچھ اس شخص کی پسند ہے جو عظیم شاعر ہے جو عوامی شاعری کا نقیب ہے جس کے شعروں میں ہماری دھڑکنیں اور جس کے کلام میں ہمارے آنسو ہیں مگر اپنی سوچ کو مزید تلخ ہونے سے بچانے کے لیے ان کی بیگم سے سوال کیا کہ :

"تم نے یہ روپ کب سے اپنایا ہے ؟"

"بات یہ ہے کہ میں ان پڑھ ہوں۔ میں جب بیاہ کر آئی تھی تو اس ماحول کی نہیں تھی، ویسے یہ ضرور تھا کہ اپنے قبیلے میں میری خوب صورتی کا چرچا تھا اور اس کی ماں بڑی منتوں سے مجھے بیاہ کر لائی تھی کہ میں اس کے گھر کا اجالا اور اس کے بیٹے کی شاعری کا سارا حسن بن کر جاؤں گی — مگر یہ فقرہ تو میں آج کل کہہ رہی ہوں اس وقت تو میں اس کا مطلب بھی نہیں جانتی تھی۔ مگر پھر پتہ ہے کیا ہوا ؟ یہ بڑی جلدی میری شکل سے اکتا گئے — اور یقین کرنا تم بہن لگتی ہو، یہ ایسی ایسی لڑکیوں کے پیچھے گھوما ہے جن کی شکل دیکھ کر گھن آئے یہ شکل سے ہٹ کر ذہن کی پوجا کرنے لگا۔ وہاں آن کر میں مجبور اور بے قصور تھی — بے بس تھی — یہ چاہتا تو مجھے چار حرف پڑھا دیتا مگر مجھے دغا دیتا رہا کہ "میں خوش قسمت ہوں مجھے اتنی حسین بیوی ملی — اور باہر دوستوں میں رونا روتا کہ شکل کو کیا کروں — میری

شاعری مر رہی ہے۔ میں کیا کر سکتی تھی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ باہر عیاشی کرے، اور پھر میرے ماں باپ ان سے کہیں اونچے ہیں انھوں نے ہی تو اسے یہاں کام پر لگوایا تھا۔ اب تو خود ترقی کر کے بڑا افسر لگ گیا ہے مگر میرے گھر والوں سے ابھی ڈرتا ہے۔ میں نے اسے ہر روز اپنا نیا چہرہ دکھانے کو خوب فیشن کرنا شروع کر دیا۔ یہ فلموں میں جانے لگا تو میں بھی فلم کی ایکٹریس کی طرح کا فیشن کرتی کہ اسے اور کوئی بھی میرے مقابلے کی عورت نظر نہ آئے۔ میں شاعری نہیں کر سکتی مگر پوری عورت تو بن سکتی ہوں نا
۔ اور میں بن گئی۔"

مگر ان کے شوہر کا خیال ہے کہ بیگم جوں جوں شوخ رنگ اور جدید فیشن کو اپناتی جا رہی ہیں میں سادگی کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔

مجھے اس گھرانے کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ نامکمل ہیں۔ تشنہ ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے اجنبی۔ خاوند بیوی کی شکل اور اس کے والدین کے اونچے رتبے پر ایک بار بک گیا۔ بیوی نے سمجھا ہمیشہ ہی اس کا پلڑا بھاری رہے گا۔ اس نے بھی فیشن کو اپنایا مگر چار لفظ خود پڑھنے کی کوشش نہ کی۔

مگر اب حالت یہ ہے کہ ایک دوسرے کے لیے دونوں بے فائدہ۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آنگن بچوں سے بھر گیا مگر بیوی کو ہر آنے والے بچے کے ساتھ خاوند ہی سے شکوہ بڑھ جاتا ہے کہ یہ تو مجھے زیادہ سے زیادہ بچوں کی ماں بنا کر جلد بوڑھا کر

دینا چاہتے ہیں ۔ تاکہ ۔ تاکہ ۔۔

اور خاوند کا خیال ہے کہ اتنے بچوں کے باوجود بیوی ابھی تک میری ذات میرے کردار پر اعتماد نہیں کر سکی ۔

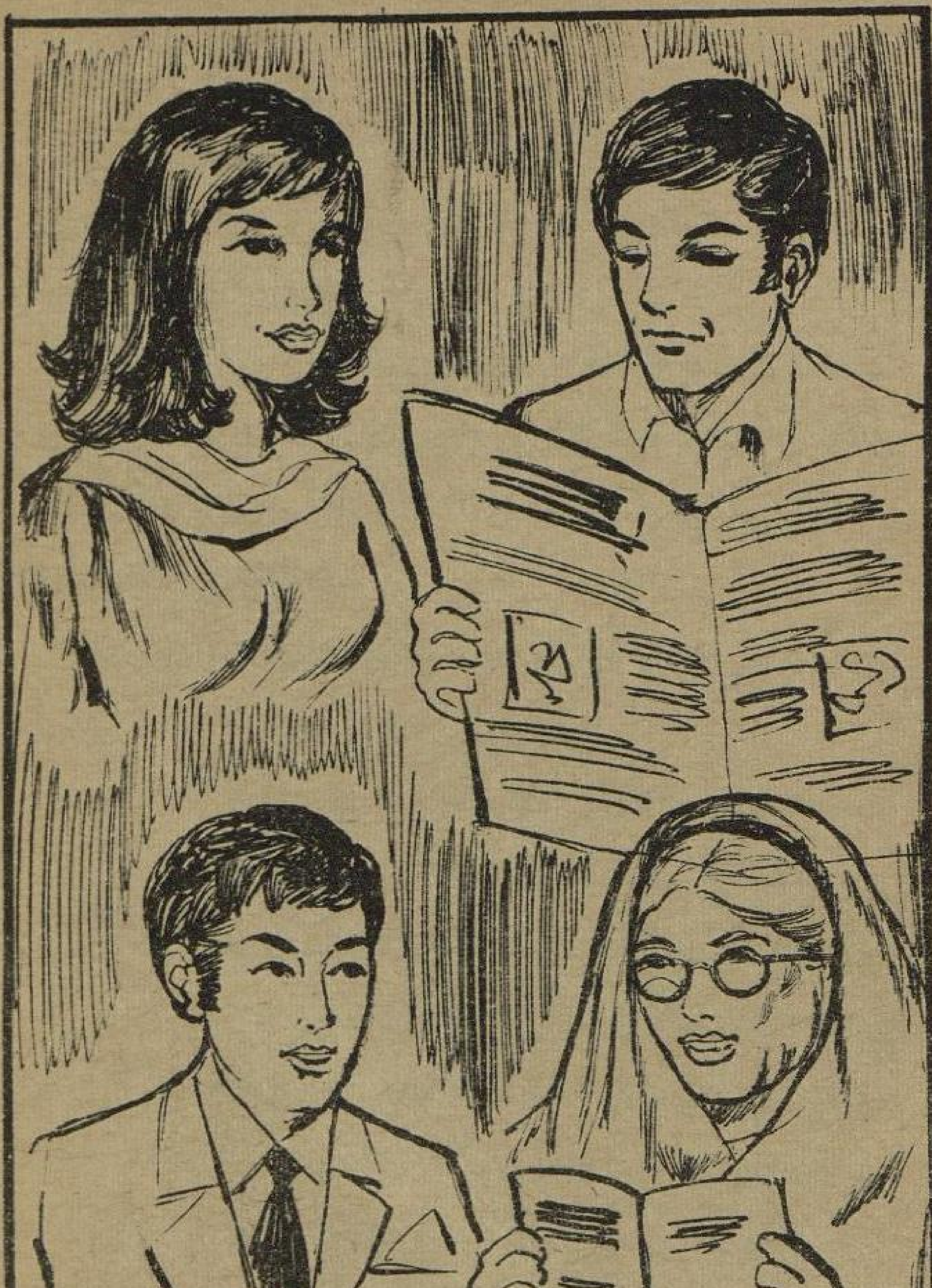
اور پھر ہوا یوں کہ بیوی سدا بہار رہنے کے لیے اور خاوند کو بتانے کے لیے کہ اتنے بچوں کے باوجود اس کے جسم اس کے چہرے پر بیتی عمر کا ایک نقش تک نہیں ۔ شوخ رنگوں، بھڑکیلے کپڑوں اور اعلیٰ قسم کے بناؤ سنگار کو زندگی سمجھ بیٹھی اور خاوند عوامی شاعری کو اپنی پناہ گاہ ۔۔

مگر ان دونوں کے خولوں سے جھانکتی ہوئی دونوں کی تڑپتی روحیں اکثر یہ سرگوشی کرتی ہیں :

"ہم اجنبی ہیں ۔ ہم ایک گھونسلے میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کو اپنے پروں سے حرارت پہنچانے والے وہ پرندے ہیں جو پر پھیلاتے ہیں تو ذہن کو سمیٹ لیتے ہیں پر جھاڑتے ہیں تو انڈے سیتی ہوئی مادہ کی آنکھوں میں احساسِ شکست اور احساسِ محرومی دو چند ہو جاتا ہے ۔ نر بھی اڑان لیتا ہے اور دانے پانی کی تلاش میں باہر نکل جاتا ہے اور مادہ بیٹھی چپ چاپ سوچتی رہتی ہے وہ جانے کس کس بالاخانے پر گیا ہوگا ۔ کس دریچے پر بیٹھا ہوگا ۔ کس صحن میں اترا ہوگا ۔ بہر حال پلٹ کر تو آئے گا ۔۔ اور پھر بڑے مان سے وہ اپنی شخصیت اور کائنات پر نگاہ ڈال کر مطمئن ہو جاتی ہے ۔"

ان کے برعکس میں ایک خاتون کو جانتی ہوں ۔

بیاہی گئی تو تین جماعت بھی مشکل سے پڑھی تھیں ۔ گھرانہ اچھا تھا ۔ گھر کا



ماحول اچھا تھا اس لیے ان پڑھ لگتی نہ تھیں مگر سسرال میں تعلیم کا چرچا تھا انھیں بھی اس ضرورت کا احساس شدت سے ہوا - اب کہیں سکول وغیرہ میں تو داخل ہو نہیں سکتی تھیں۔ خاوند سے کہا کہ مجھے کمرے میں علیحدہ سے پڑھا دیا کریں - اردو میں روز کا اخبار رسالہ اپنے میاں سے پڑھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ انگلش اتنی کہ ڈبوں، بوتلوں پر لکھے نام کا اندازہ ہو سکے۔

ان کا کہنا ہے کہ :

"ہمارے ہاں جو لوگ جو عورتیں آتیں - میں بیٹھی ان کی باتیں سنا کرتی اور اپنے منہ ہی منہ میں دوہرایا کرتی۔ خود کم بولتی کہ کبھی غلط نہ بول دوں - گھر سے بھی کم ہی نکلتی - بس اپنے میاں کے ساتھ یا ساس نند کہیں عزیزوں میں لے جائیں تو ــ وہاں خود بن سنور کر اَپ ٹو ڈیٹ فیشن کر کے جاتی کہ ان پڑھ ہونے کی کمی کہیں سے جھلک نہ آئے -"

پہلا بچہ ابھی تین برس کا تھا کہ اسے انگلش نرسری میں داخل کروا دیا وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جو بات کرتا اسے یاد کرتیں - اب بڑا بیٹا ایم اے کر چکا ہے - بیٹی بی اے میں ہے اور ماں بڑے مزے سے ان سے انگلش بول لیتی ہے اور وہ بڑے فخر سے کہتی ہیں :

"میں نے اپنے بچوں سے علم سیکھا ہے -"

اپنی کار خود چلاتی ہیں - بڑی سنجیدہ قسم کی خاتون ہیں - فیشن بھی کرتی ہیں مگر سب سے زیادہ جو توجہ دی تو انھوں نے گھر کے حالات جان کر اپنی تعلیم پر ــ یوں ان کی اس محنت لگن اور ذہانت سے گھرانے کا معیار بڑھا۔

سکون و اطمینان ہوا — اور ان کا گھر — من چاہی جنّت کہلوانے کا حق دار ہو گیا — اور یہ سب عورت کی سُوجھ بُوجھ سے ہوا۔

کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ بیوی بے چاری شوہر کے عزیزوں کے عتاب تلے آجاتی ہے اور یوں اس کی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے مگر ایک اچھی بیوی کا کام ہے کہ ان تمام مراحل سے بہ احسن گزر جائے۔

بات کا بتنگڑ بنانے کی بجائے بتنگڑ کو سمیٹ کر صرف اپنا ذاتی مسئلہ بنا دے۔

ایک طالبہ تھیں۔ امیر والدین کی نخریلی۔ سائیکل پہ سکول اور کالج جاتی۔ کار خود چلاتی۔ شروع میں یہ عادتیں سسرال والوں کو بھائیں اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا گیا۔ منگنی کے ایام تو اکٹھے گزرے۔ پکنک مناتے، سیریں کرتے۔ فلمیں دیکھتے۔ مگر جونہی بیاہ ہوا، اور سسرال کی چوکھٹ پہ قدم رکھا انھوں نے یہ تیغ بٹھا دیا کہ یہاں تو بحیثیت بیوی پردہ دار بن کر رہنا ہو گا۔ اس کے علاوہ پکچر نہیں جانا، سہیلیوں سے نہیں ملنا، اپنے کسی بھی "کزن" کو بغیر اجازت یا میاں کی عدم موجودگی میں ملنا ممنوع قرار پایا۔

اس نے بالکل ان کے احکام کو اپنی بیا ہتا زندگی کا شعار بنا لیا۔ مگر دو ہی ماہ بعد انھوں نے ایک اور وار کیا۔ اپنا باورچی نکال دیا اور بہو سے کہا کہ تم باورچی خانہ سنبھالو — مگر گھر آئے مہمانوں کے سامنے نہیں آنا — ادھر کوئی عزیزہ یا مہمان آن کر "دلھن" کے بارے میں پوچھتا تو جواب ملتا:

"کرم خراب نکلے ہمارے۔ کہاں سے
پیش پڑ گئی کسی باورچی کی روح۔ تمام
دن باورچی خانے میں رہتی ہے

ڈھنگ کا کپڑا نہیں پہنتی - اوپر سے
ہمیں کہا جاتا ہے کہ ہیں کسی مہمان کے
سامنے نہیں آؤں گی - اسے تو انسانوں
سے نفرت ہے گویا۔"

تعلیم کے پندرھویں سال سے نکال کر بیاہ ہی گئی . . . . .

. . . . . یہ بیوی حیران پریشان صبر و ہمت کی تصویر بنی سب برداشت کرتی رہی اور کبھی کبھی میاں کے سامنے رو رو کرتی رہی - میاں بھی کہتے :

" بھئی اس گھر میں اماں کا سکہ چلتا ہے - میں تو خود حیران ہوں کہ اب تم میں انھیں کیا برائی نظر آئی - دراصل تمھارے والدین نے بھی تو انصاف نہیں کیا - اتنی امارت دکھائی - اور - جہیز کیا دیا ؟ - معمولی۔"

اور بیوی بے چاری اپنی ساری خدمتیں گنوا دیتی -

مگر چند ماہ بعد نیا حکم ملا کہ :

" میاں سے بات چیت نہیں کرنی بلکہ اس کے کمرے میں نہیں جانا۔"

عورت سب کچھ برداشت کر گزرتی ہے - سسرال کی سختیاں، جہیز کی کمی کے طعنے، اپنی بدصورتی، والدین کی غربت کے شکوے شکایتیں اور سسرال کا تضاد - مگر اس حالت میں کہ خاوند کا پیار اور دلجوئی میسر رہے -

اب وہ بھی ڈگمگائیں -

مگر انہی دنوں وہ پہلی زچگی کے سلسلہ میں میکے بھجوا دی گئیں اور یوں پلٹ کر سسرال والے اس کا حال پوچھنے بھی نہ گئے - میکے میں بات کھلی - والدین نے یہی مناسب جانا کہ " طلاق " لے لی جائے - مگر وہ بضد کہ :

" طلاق نہیں لوں گی - یہ جب تک مجھے تنگ کر سکتے ہیں کر لیں - اگر آج میں

کم جہیز کا طعنہ سن کر طلاق ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی تو کل کو بے شمار لڑکیاں اس ناکردہ جرم کی سزا بھگتیں گی کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اور اب تو مجھے اپنے مستقبل سے زیادہ عزیز اس بچّے کا مستقبل ہے۔"

ڈیڑھ برس بعد میکے والے خود ہی پہلی زچگی کا بے شمار سامان (جہیز کی کمی پورا کرنے کو حالانکہ جہیز بھی کم نہ تھا بے شمار تھا مگر سسرال کو شکایت تھی کہ صرف پچاس ہزار کا سامان ہے۔ اس کے علاوہ نقد بھی بیس پچیس ہزار ہوتا تو کیا بات تھی) لے کر سسرال گئے اپنی بچی کو چھوڑنے ۔ مگر اس بار بھی سامان ناک تلے نہ آیا۔ اب جو ساس نندوں نے زبان کھولی تو وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنا معمول بنا لیا کہ جواب ہی نہیں دینا۔ بول لیں۔ طعنہ دے لیں۔ کبھی تو ہاریں گی۔

مگر اب اس نے اپنے رویّے میں ایک تبدیلی کر لی۔ سسرال میں آنے والے مہمانوں اور عزیزوں کے ساتھ انتہائی اخلاق سے پیش آتی۔ ان سے انتہائی نیک سلوک کرتی اور انھیں رفتہ رفتہ اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ادھر میاں کو بھی ساری باتیں سمجھائیں۔ جہیز اور بیوی کا فرق اس کے ذہن نشین کیا اور اسے بدلنا شروع کیا۔

ہوا یوں کہ !

بوٹوں کے تسمے باندھتی کھولتی بیوی کے کانپتے ہاتھوں پہ بوٹ کے نوک کی سختی جیسے کم ہونے لگی اور ایک دن اس نے تسمے باندھتی بیوی کے ہاتھ اپنی گود میں ڈال کر تسمے خود ہی باندھ لیے۔ ساس صاحبہ کو بھنک پڑی تو وہ حد درجہ گھبرائیں مگر اس نے ساس کے احترام میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیا۔

بلکہ ادب بڑھ گیا۔

اور اب یہ حالت ہے کہ عید، شب برات، سالگرہ پر وہ اپنی ساس کو تحفہ بڑے ادب سے پیش کرتی ہے اور ساس بھی اس کی شمولیت کے بغیر اپنی تقریب ادھوری سمجھتی ہے۔

میں ایک دن اس سے ملی اور پوچھا :

"شادی کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے ؟"

وہ ہنس کر بولی :

"تجربات سے بھرپور زندگی !"

میں نے پوچھا :

"مگر تمھارے تجربے کیسے رہے ؟"

"تم میرے حالات جانتی ہو پھر بھی پوچھتی ہو تو سنو — یہ میرے لیے تلخیوں سے بھرپور زندگی رہی۔ مگر اب مجھے تسکین ہے۔ بات یوں ہے رفعت بہن اگر اس وقت میں اپنے میکے کی امارت کے زعم میں میکے جا بیٹھتی اور طلاق لے لیتی تو یقیناً میرا مستقبل خراب ہو جاتا — پھر مجھے یہ احساس بھی تھا کہ یہ کب تک جہیز کو اہمیت دیں گے۔ کل کو اپنی بیٹیاں بیاہیں گے۔ دوسری بہوئیں لائیں گے ان سے میرا موازنہ کریں گے تو خود احساس ہو جائے گا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے ان تجربوں میں بہت کچھ کھویا ہے۔ اپنی زندگی کے حسین ترین ایام بلکہ سال۔ اپنی شادی بلکہ ازدواجی زندگی کی ابتدائی آرزوئیں، اپنی صحت — کون نہیں جانتا کہ جوان سہاگن پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ اسے خاوند سے علیحدہ کر دیا جائے۔"

"مگر اس سزا میں تو تمھارا خاوند بھی برابر کا شریک تھا۔" میں نے ٹوکا

"جانے دو — رفی بہن — میرے دکھوں کو اب بالکل ہی برہنہ نہ کرو —



اب تمھیں کیسے بتاؤں کہ وہ تو آسودگی کی تلاش میں باہر چلا جاتا تھا اور مجھے جتا کر۔ پھر یوں بھی ہوتا کہ گھر میں ان کی کوئی کزن یا ان کی بہن کی کوئی سہیلی آن کر ڈیرہ ڈال لیتی۔ یہ لوگ ہنستے، تاش کھیلتے، سیریں کرتے، راتوں کو پکچر دیکھ کر دیر سے آتے اور میں چپ چاپ دیکھتی رہتی — مگر اب وہ اپنی کرتوتوں پہ خود ہی شرمندہ ہے اور اب میں سوچتی ہوں میں اس وقت غصے، بچپنے، بے وقوفی میں اگر میکے والوں کی شہ پہ طلاق لے لیتی تو میرا کیا حشر ہوتا۔ اس معاشرے میں جہاں بیس بیس ہزار حق مہر لکھوا کر لائی گئی بیوی کو کم جہیز کی سزا میں گھر کی باورچن بنا لیا جاتا ہے وہاں ایک طلاق یافتہ لڑکی کا مستقبل کیا ہوتا۔ میں کہتی ہوں کہ ازدواجی زندگی پل صراط ہے۔ اپنے میں حوصلہ، اتنی اخلاقی بلندی ہونا چاہیے کہ ہم نازک راستوں پہ ڈگمگائیں نہیں۔ اب تم اسے تو جانتی ہی ہو ناں۔ وہ اپنے محلے ہی میں رہتی تھی — سلیمہ — اسے کتنا زعم تھا اپنے میکے کی امارت کا — اپنے حسن کا — اور — سب سے بڑھ کر اپنی ملازمت کا —"

اور مجھے بھی سلیمہ یاد آ گئی۔

میکے والے گو زیادہ امیر نہ تھے اور پڑھی ہوئی بھی صرف "جے وی" تھی کسی گاؤں میں معلمہ تھی۔ سسرال گئی تو اندھوں میں کانا راجہ بن کر یہ سمجھ بیٹھی کہ بس میں ہی تعلیم یافتہ بہو ہوں۔ یہ سب سسرالی عزیز تو میرے سامنے جھک کر رہ جائیں گے دس پندرہ روز کے اندر ہی اندر سسرال والوں کا سارا شجرہ کھنگال ڈالا اور میاں کی ایک کمزوری پکڑ لی۔

ذرا تصوّر کیجیے!

بیس روز کی بیاہی دلہن گہنوں کپڑوں سے لد کر بیچ صحن کے سیاپا کرنے بیٹھ جائے تو کیسا منظر ہوگا:

"ارے مجھے کیوں بیاہ کر لایا تھا جو اندر کمرے میں فلاں عورت کی کلائی پکڑ ی تھی — وہ تو اندھیرے میں مجھے نظر نہ آیا ورنہ —"

اور بات پھیلتے پھیلتے جانے کہاں تک پہنچی۔ میاں نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا مگر وہ دوسرے ہی دن میکے چلی آئی۔ یہاں بھی سب کو بتایا کہ میرا میاں تو کسی اور سے دوستی لگائے بیٹھا ہے اسے بھلا میری کیا ضرورت — دنیا کو دکھانے کے لیے شادی کی ہے۔ میں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دم لوں گی۔

اور پھر یہ پانی یوں الگ ہوا کہ شادی کے ایک ماہ کے اندر اندر طلاق ہو گئی اور طلاق کے اس واقعہ کے بہت عرصہ بعد میں نے اس سے پوچھا :

"تمھیں افسوس تو ہوا ہوگا اپنی جلد بازی پر کہ کیوں طلاق لے لی ؟"

"ہاں — اب سوچتی ہوں بے چارہ اتنی منتیں کرتا تھا مگر اس وقت میرے دماغ میں جانے کیا سمائی تھی۔"

میں نے کہا :

"اس وقت تیرے دماغ میں "انانیت" سمائی تھی۔ تم سمجھتی تھیں کہ ایک کو طلاق دوں گی دس اور چلے آئیں گے کہ :

"ایسی شریف خاتون جس نے خاوند کو مشکوک پایا تو اسے چھوڑ دیا۔ اس دور اس کلجگ میں ایسی پاکیزہ عورت !
اچنبھے والی بات ہے ہم تو اسی کی تمنّا کر رہے تھے۔"

مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا اور ابھی تک تمھیں کوئی بھی پیغام نہیں ملا۔"

"ہاں ! تمھاری بات ٹھیک ہے۔"

"کاش تم عورتیں اس بات کو پلے باندھ لو کہ مرد اس عورت کو پسند کرتا ہے جو اس کی غلطیوں، اس کی کوتاہیوں کو دیکھے اور اس پہ پردہ ڈال

دے ۔عورت چند بار ایسا کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے پیار، اپنے احترام کی آنچ تیز تر کر دے تو مرد کو خود ہی اپنی عیاری پہ ندامت اور معصومیت پہ پیار اور ترس آجائے گا اور وہ اپنی روش بدل لے گا یا مرد پسند کرتا ہے ایسی عورت کو جو اس کے گناہ دیکھے اور مناسب طریقے سے سمجھا کر اس کا رخ اپنی طرف موڑ لے ۔کیا تم نے اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی ؟"

"نہیں بہن ! بلکہ وہ بے چارہ تو میرے پاس آکر منتیں کرنے لگا تو میں نے کہا :

"جا پرے — ہو — ہٹ — مجھے ہاتھ نہ لگا —"

اسی لیے تو میکے آگئی تھی — اس سے دور —"

"تو پھر سلیمہ بہن تم ہی بتاؤ کہ تم نے ایک مرد کو سرِ عام رسوا بھی کیا اور اس کا رخ موڑنے کے لیے اپنا آپ بھی پیش نہ کیا تو پھر وہ طلاق نہ دیتا تو کیا کرتا ۔خود ہی انصاف کرو — اگر کسی کو بُرے راستے سے ہٹانا ہے تو اسے اچھا راستہ دکھاؤ ۔جو راہ ہے ہی پھینک کر اندھیرے میں چھوڑ کر تم یہ کہو کہ یہ انسان خود ہی سیدھا راستہ اختیار کرے گا ۔مناسب نہیں ۔خدا نے بھی اپنے بندوں کو دنیا میں بھیج کر ان کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے رسول بھیجے ، کتابیں اتاریں ۔تم خاوند کے لیے وہاں گئی تھیں ذرا صبر سے اس کی عادت کا مطالعہ کیا ہوتا ، وہ ایسا کیوں ہے ؟ غیر عورت سے دوستی کیوں لگائی ؟ کنوارپنے میں لگائی تھی ؟ کیا تمھاری موجودگی میں بھی اس کی دوستی کا وہی عالم تھا ؟ یا وہ پرانی دوستی کو ختم کرنے گیا تھا — تم نے اپنے خاوند کو غیر عورت کی کلائی تھامتے دیکھا تو

بات کا بتنگڑ بنالیا۔ اب اگر تم شادی کرو، اور تمھارا خاوند باہر ہی کسی دوسری جگہ دوستی لگائے ہوئے ہو، اور تمھیں پتہ ہی نہ چلے تو پھر کیا کروگی۔ اے بہن! یاد رکھو! یہ مرد کھلے سمندر کی مچھلی ہوتے ہیں تم اس کے لیے کہاں کہاں جال ڈالوگی۔"

اس نے سر جھکالیا اور دھیرے سے بولی:

"ہاں طلاق لینے میں واقعی میں نے جلدی کی — اور — اب تو میرے ہاتھ میں طلاق کی سند ہے اور رشتے کے پیغام راہ بھول گئے ہیں۔"

ایک مرد کے متعلق کانوں میں بھنک پڑی کہ اس کے تعلقات فلاں عورت سے ہیں مجھے یقین نہ آیا کہ گھر میں خود اس کی بیوی اور بچے موجود تھے۔ بیوی بڑی ہی سگھڑ باسلیقہ خوش شکل خاتون ہیں مگر راوی کچھ عینی شاہد بھی تھا اس نے بڑی قسم کی باتیں کیں تب میں نے سوچا ان کی بیوی سے بات کیوں نہ کی جائے۔

بیوی سے اتنا ہی پوچھا:

"کہیے — گھر کے حالات کیسے ہیں؟"

"بڑے پُرسکون —" انھوں نے کمال متانت سے جواب دیا۔

"یہ جو لوگ باتیں کرتے ہیں۔ انھوں نے آپ کے سکون کو برباد نہیں کیا؟"

"اس کی میں عادی ہو چکی ہوں۔" وہ کہہ کر سنجیدہ ہوگئیں۔

"یعنی — ؟" میں حیرت زدہ رہ گئی۔

"آپ نے بھی سنا ہوگا ناں کہ میرے میاں کے اپنی فلاں عزیزہ سے ناجائز تعلقات ہیں تو میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میں نے تو مدّتوں سے سینے پہ صبر کی سِل رکھ لی ہوئی ہے۔ میں نے تو جوانی کے دنوں میں یہ ساری مصیبتیں سہی ہیں۔ وہ تو اپنے بچوں کی بیماری کا بہانہ لگا کر راتوں کو انھیں کمرے سے بلا کرلے جایا

کرتی تھی اور میں تنہا بستر پر بیٹھ کر رویا کرتی تھی۔ ان جھگڑوں میں ایک بار نوبت طلاق تک جا پہنچی تھی مگر ان کی عزیزہ نے طلاق نہ ہونے دی کہ ایسا کرنے سے بات پھیل جائے گی اور کل کو بچوں کی شادیاں نہیں ہو سکیں گی۔ اس لیے ہماری صلح ہو گئی — اور ہمارے گھر آنا جانا بھی کم کر دیا مگر میرے میاں روز جاتے رہے۔"

"ان کے خاوند کو بُرا نہیں لگتا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کمزور آدمی ہے — اور مرد جب کمزور ہو جائے تو بے غیرت بھی ہو جاتا ہے۔ یوں بھی بات مشہور ہے کہ حرام منہ کو لگ جائے تو چھٹتا نہیں۔"

"اب اس خاتون کے بچّے جوان ہیں تو وہ بھی نہیں دیکھتے؟"

"وہ دیکھیں نہ دیکھیں خدا ضرور دیکھتا ہے۔ میرا صبر رنگ لایا ہے جو رشتے آتے ہیں طے نہیں پاتے جواب مل جاتا ہے کہ ماں کا کردار مشکوک ہے۔ اب مصیبت آئی ہوئی ہے الٹا مجھے کوسنے دیتی ہیں کہ یہ کہیں رشتہ نہیں ہونے دیتی حالاں کہ خدا گواہ ہے میں دل سے چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد ان کے بچّے بیاہے جائیں تو میرے گھرانے کا سکون لوٹ آئے۔"

"اپنے بچوں سے آپ کے میاں کا سلوک کیسا ہے؟"

"اب بہتر ہے کہ بچّے اب اس عمر میں ہیں کہ اپنا حق خود مانگتے ہیں۔ شروع میں یہ بھی لڑائی رہی ہے۔ ان کا مطلب تھا کہ بچوں کو میں سکھاتی ہوں پھر رفتہ رفتہ انھیں احساس ہو گیا۔ اب آجکل کے بچّے اتنے منہ پھٹ ہیں۔ ابّا وہاں جانے لگیں تو فوراً کہہ دیں گے :

"ابا جان آپ وہاں جا کر بور نہیں ہوں گے۔ وہ آنٹی تو بڑی مصنوعی قسم کی باتیں کرتی ہیں وہاں نہ جایا کیجیے۔"

"مگر شروع میں آپ نے سمجھایا نہیں؟ اور آپ کو پتہ کب لگا ان حالات کا؟"

"یقین کیجیے مجھے پہلے ہی روز علم ہو گیا تھا۔ جب یہ کمرے میں دیر سے آئے اور صبح ہی صبح وہ محترمہ جگا کرے گئیں اور ان سے اس طرح کی باتیں کرنے لگیں جیسے جھاڑ پلا رہی ہے۔ گھر میں اس وقت وہ بڑی تھیں۔ میں نے بُرا تو منایا مگر اتنا نہیں۔ اس کے بعد جب انھوں نے اکثر راتوں کو انھیں میرے کمرے سے غائب کرنا شروع کیا تو میں سارا معاملہ جان گئی۔ وہ بہت ذلیل عورت ہے۔"

"اور تمھارا میاں؟" میں نے جھٹ سے پوچھا۔

"وہ بے چارا پھنس گیا ہوا ہے۔"

"مگر اس دلدل سے نکل تو سکتا ہے۔"

"وہ بڑی کمینی عورت ہے۔ یہ آج اسے چھوڑ دیں کل کو ہماری بچیاں — ہم سرِ عام بدنام ہوں گے۔ ہم پر ایسے ایسے الزام دیئے جائیں گے کہ ہم جینے سے موت کو ترجیح دیں اس لیے میں تو صرف خدا سے دعا کرتی ہوں اور بس!"

"آپ کی نندیں ساس معاملہ جانتی ہیں؟ — انھوں نے انھیں کبھی نہیں سمجھایا؟"

"میری ساس نے حالات دیکھ کر ہی ہمیں علیحدہ گھر بسانے پہ مجبور کیا تھا اور یہ ان کی بڑی عقل مندی تھی۔ میں عام بیویوں کی طرح ان سے لڑتی ہوں اور ناراض ہو کر اپنے میکے جانے کی بجائے اپنی کسی نند یا دیور کے ہاں ہی جاتی ہوں کہ مجھے گھرانے کی عزت عزیز ہے اور میں نہیں چاہتی کہ زیادہ بات پھیلے اور کل کو میری بچیاں بھی بیاہنے سے رہ جائیں۔ دوسری بات یہ کہ میری ایک دوست تھی اس کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا اس کے میاں کے بھی اپنی بھابی سے تعلق تھے۔ شروع میں یہی احساس رہا۔ بڑی بھابی ہے لاڈ پیار ہے مگر دو بچے ہی تھے کہ میاں مستقل طور پر بڑے بھائی کے ہاں منتقل ہو گیا۔ اسے میکے بھجوا دیا کہ بڑے بھیّا بیمار ہیں۔ میں ان کا علاج کروا لوں — تین برس بعد بھیّا چل بسے۔ لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ اسے زہر

کھلا کھلا کر دھیرے دھیرے مارا تھا اور پھر میری دوست کو طلاق دے کر بھابی سے نکاح پڑھوا لیا۔ اب اس کے بچے جوان ہیں اس نے ساری عمر میکے کی دہلیز پر سلائی کر کے بچے پالے پڑھائے۔ میں اپنے اس انجام سے ڈرتی رہی اور گزارہ کرتی چلی آتی۔ اب تو کشتی منجدھار سے نکل آئی ہے اور حالات پہلے سے بہت سدھر گئے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے ساری زندگی کبھی سکھ کا سانس نہیں لیا۔ ایک دھڑکا سا لگا رہا جانے کس دن ہمیشہ کے لیے اسی کی چوکھٹ پر جا پڑیں۔ جانے میرے ہاتھوں میں طلاق کا پروانہ کب آ جائے۔ بلکہ آپ کو مزیدار بات سناؤں۔ ایک دن بچے ٹی وی پر فلم دیکھ رہے تھے۔ اس میں ایک خاوند دوسری شادی کرتا ہے پہلی بیوی دور دکھ برا حال کرتی ہے۔

تب میری بڑی لڑکی بولی :

"خود رو رہی ہے خاوند کو گولی کیوں نہیں مار دیتی۔"

دوسری بولی :

"خاوند کو کیوں۔ دوسری بیوی کو زہر دے دے۔"

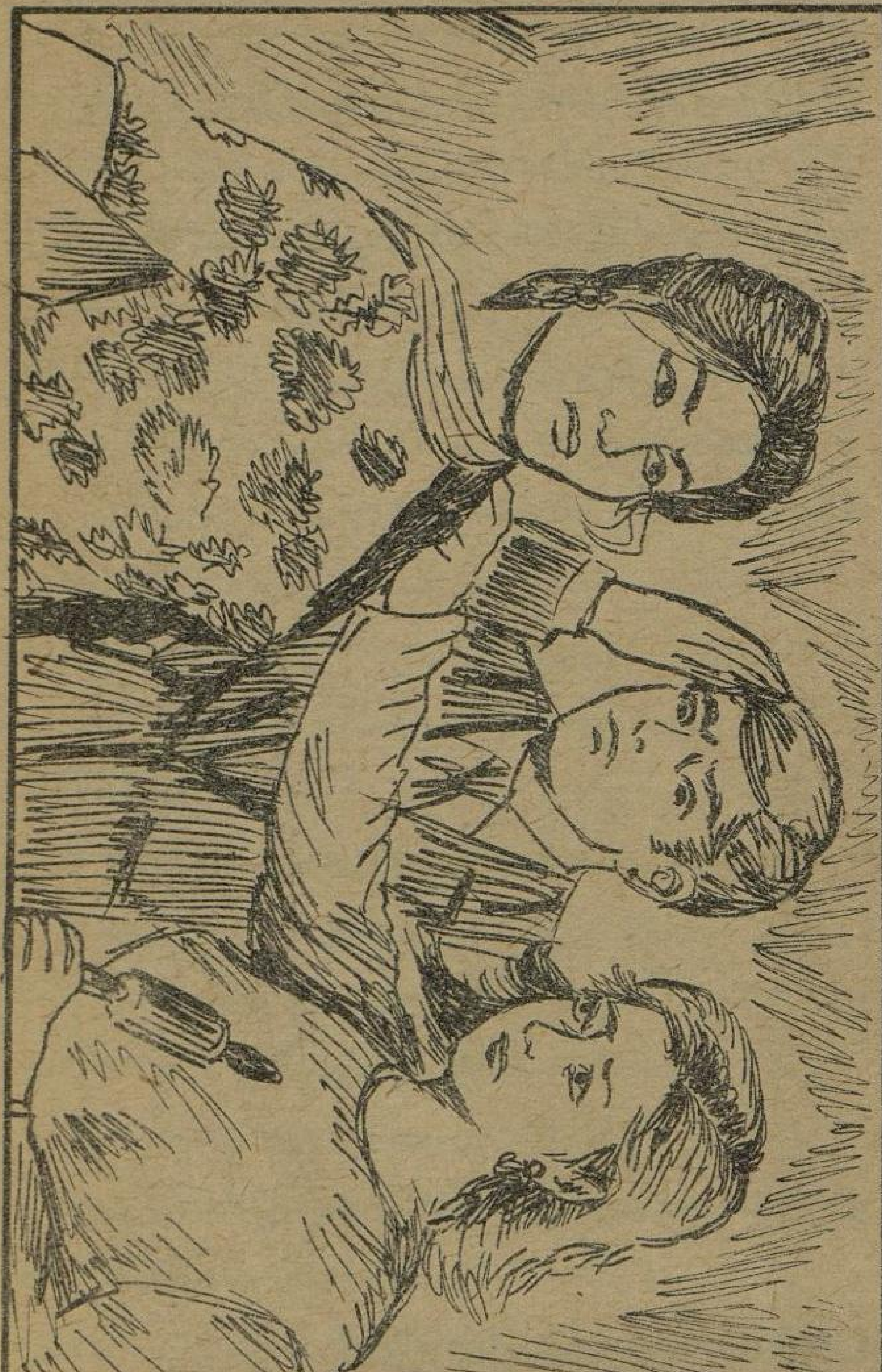
لڑکا بولا :

"سزا خاوند کو بھی ملنی چاہیے — میں اس کا بیٹا ہوتا تو اس کے دوستوں سے مل کر اس کا سوشل بائیکاٹ کروا دیتا۔"

تب میرے میاں ہنسے اور بولے :

"حد ہو گئی — بھئی ایک ووٹ بھی میرا نہیں — تم نے تو قدم بہت مضبوطی سے جما لیے ہیں۔"

اس دن پہلی بار میں نے سکون کا سانس لیا اور اپنے بچوں کو بہت سی دعائیں دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیانت داری سے سوچا :



اب میں بیوی کی حیثیت میں کم اور ماں زیادہ ہوں۔

خاوندوں کے قصور معاف کر کے زندگی گزارنے والی خواتین بھی اس دنیا میں ہیں مگر ایسے خاوند بہت ہیں جو بیوی کے حقوق پورے نہیں کرتے بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مرد شادی کے بعد بیوی کے ہاتھ میں تو اس کے "فرائض" کی فہرست تھما دیتا ہے مگر اپنے "حقوق" کو نظر انداز کر دیتا ہے اور یہ معاملہ ہمیشہ ایسے گھروں میں پیش آتا ہے جہاں مرد نے ایک سے زیادہ شادیاں کر رکھی ہوں۔

مسلمان مرد دوسری شادی کے لیے قرآن مجید سے لے کر حدیث تک کے حوالے بڑی روانی سے بیان کرتا چلا جاتا ہے مگر ان پابندیوں کا ذکر تک نہیں کرتا جو دوسری شادی کے ضمن میں ان پر بھی لاگو ہوتی ہیں۔

سب سے بڑی بات ہوتی ہے :

"انصاف"۔

مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ ایک بیوی ہمیشہ دکھی ہوتی ہے اور انصاف کی دہائی دیتی ہوتی ہے۔

ایک بار میں نے ایک خاتون سے پوچھا جو ایک عالم دین کی تیسری بیوی تھیں کہ :

"کیا۔ حضرت انصاف کرتے ہیں ؟"

جواب ملا :

"ہاں ۔ ہفتے کے دن مقرر ہیں کہ انھوں نے کہاں کھانا کھانا ہے، اور کہاں رات بسر کرنا ہے۔"

میں نے پوچھا :

"پھر آپ لوگ مطمئن ہو جاتی ہیں ؟"

"ازدواجی زندگی کے تقاضے بڑے مختلف ہوتے ہیں۔ کھانا، کپڑا، اوڑھنا بچھونا ہی زندگی نہیں ہوتے جسمانی اور جنسی تقاضے بھی ہوتے ہیں اور باری باری سے بیوی یا خاوند کے ساتھ وقت بسر کرنے کا طریقہ — شروع میں تو مجھے یوں لگا جیسے ہم مجرم بچے ہیں، جنھیں تھوڑی دیر کے لیے کسی بند کمرے میں بند کر دیا گیا ہے — میں آپ کو بتاؤں ہمارے ہاں بہت انصاف ہے۔ ہم تینوں بیویاں اور چوتھی کی اولاد (کہ وہ بیوی بقید حیات نہیں) آپس میں کبھی نہیں لڑتے۔ ہم ایک سے کپڑے پہنتی ہیں مگر ہوتا یوں ہے کہ ہم تینوں میں عمر کا فرق ہے کئی بار ایک سا رنگ اور کپڑا نہیں سجتا اور یوں بھی وہ سکول کی یونیفارم کا سا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔ ہمارے زیور ایک جیسے ہیں اس کے باوجود — کم از کم میرے دل میں تو ایک خلش ضرور رہتی ہے — اور میں کہتی ہوں جب میں اپنی جگہ مطمئن نہیں — تو میرے میاں — ہم تینوں کا بوجھ کیسے سہار رہے ہیں۔"

"آپ کی دوسری سوکنوں کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا

"ظاہر ہے۔ عورت عورت سے حسد کرتی ہے۔ دونوں بڑی بیویاں مجھے منہ پر نہ کہیں — مگر نوکرانیوں، دھوبنوں، جمعدارنیوں سے بات کرتے ہوئے وہ یہ طعنہ ضرور دیتی ہیں کہ :

"والدین دیکھ کر نہیں بیاہتے، بھرے گھر میں اپنی لاڈلی کا اضافہ یوں کر دیتے ہیں جیسے بچھڑی بچی کو باپ کے گھر چھوڑنے آئے ہیں والدین سوچ سمجھ کر شادی نہیں کرتے۔ پیسہ اندھا کر دیتا ہے — بعد میں آنے والیاں تو پہلی بیویوں کا حق مارتی ہیں۔ خدا انھیں سمجھے گا۔

ایسے میں خاوند کی باری بھی کسی دوسری کے ہاں ہو تو وہ دن اپنے بہت بُرے کٹتے ہیں۔ کیوں کہ اکثر سنا ہے گھر میں ساس نند طعنہ دے دیں تو تنہائی میں خاوند کے پاس بیٹھ کر رو لینے سے دکھ کم ہو جاتا ہے اور یہاں خاوند کا دیا ہوا دکھ سینے کی چٹان بن جاتا ہے جس کے تلے اپنا سانس ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔"

آخر یہ مرد دوسری شادیاں کرتے ہی کیوں ہیں ؟

معاشرتی جائزے سے احساس ہوتا ہے۔ شروع میں تعداد ایسے مردوں کی تھی جن کی شادیاں خاندانی روایات کے عین مطابق اپنے ان گھرانوں میں ہوئیں جہاں لڑکیاں اَن پڑھ تھیں۔

ان مردوں نے گویا اپنی بزدلی کو روایتی سعادت مندی کا لبادہ پہنایا۔ شادی کرلی اور بیوی کو اپنی ماں کے پاس رکھا۔ جب کبھی اعلیٰ ملازمتوں پہ اپنے ساتھ لے کر آئے تو بیوی کو قدم قدم پہ احساس دلایا کہ :

"تم میری اس زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔"

اور پھر بیوی کو اپنے میکے یا اس کے میکے بٹھا کر دوسری شادی کر ڈالی۔

ظاہر ہے کہ اَن پڑھ اور تعلیم یافتہ خواتین میں بجائے باہمی اتحاد کے تصادم کی فضا پیدا ہو گی۔ اُن اَن پڑھ خواتین نے انتقاماً اپنی بیٹیوں کو پڑھایا اور اپنے طور سے مطمئن ہو گئیں کہ اب ان کی سوکن نہیں آئے گی۔ مگر سوکن ہر دور میں پیدا ہوتی رہی :

کہیں نرینہ اولاد کی تمنا میں،
کہیں اراضیات کے جھگڑے میں ،
کہیں تحفظ کے باب میں !

ایک صاحب نے پانچ بیٹیوں کی ماں پر سوکن لا بٹھائی کہ ان کی اتنی جائداد کا وارث تو ہونا چاہیے۔ بیٹیاں تو دھن سمیٹ کر پرائے گھر لے جائیں گی۔ پہلی بیوی چپکے سے سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ بیوی میاں سے فرمائش کر کے گھر علیحدہ کر لیا اور میاں نے باری مقرر کر لی۔ مگر باری کئی بار وعدہ خلافی کی نذر ہو جاتی۔ پہلی کے پاس کبھی پندرہ بیس روز میں چکر لگتا۔

سال بھر بعد دونوں بیویوں کی زچگی ہوئی۔

خدا کا کرنا ۔ پہلی بیوی کے ہاں لڑکا اور دوسری کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اور یوں پانچ برس میں پہلی کے ہاں تین بیٹے اور دوسری کے ہاں چار بیٹیاں ہو گئیں۔

پہلی بیوی طنز سے کہتی :

"یہ سب تو میرے صبر کا پھل ہے۔"

اب کیا بیٹے کی تمنا مرد ہی کو ہوتی ہے عورت کو نہیں ہوتی ؟ حالاں کہ دیکھا جائے تو عورت کو بیٹے کی زیادہ خواہش ہوتی ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ بیٹا نہ ہوا تو سوکن سے پالا پڑ جائے گا۔

کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسری شادی کے بعد خاوند پہلی بیوی سے جسمانی تعلق ختم کر لیتا ہے اور یہاں آ کر معاشرے میں بداخلاقی کا نیا باب کھلتا ہے۔ خواتین کے روایتی توہمات انتہا کو پہنچتے ہیں اور تعویذ گنڈے والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔

ایک معروف ادیب سے میں نے پوچھا :

"آپ کی بیوی تو ہر لحاظ سے بہتر ہیں پھر سنا ہے آپ نے دوسری شادی کر ڈالی !"

جواب ملا :

"وہ شادی میری مجبوری تھی"۔

مرد جب یہ جواب دے تو کون نہیں جانتا کہ وہ انتہائی بزدل ہے۔

میں نے ازراہِ مذاق پوچھا :

"مجبوری کیسی — اگر کوئی کنواری لڑکی یہ فقرہ کہتی تو بات سمجھ میں آسکتی تھی مگر آپ — جو اپنی تحریروں میں بڑے ترقی پسند، حقیقت پسند اور جانے کیا کچھ نظر آتے ہیں ....."

وہ ہنسے اور بولے :

"میری والدہ دراصل بہت ضدی ہیں اور وہ یہاں لوگوں سے وعدہ کر چکی تھیں کہ ان کی ایک بیٹی بیاہ کر لائیں گی۔ آپ نہیں جانتیں۔ ماں مجھے بے حد عزیز ہے اور ان کا حکم میرا ایمان —"

"تو اس کا مطلب ہوا آپ ماں کے قدموں میں جنت کا دو منزلہ تعمیر کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے"۔

"یہی سمجھ لیجیے"۔

"پھر ؟"

"اپنے گھر کا سکون بھی کھو بیٹھا — اور — اب تو مسلسل ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں۔"

"کیوں ؟"

"اب میری پہلی بیوی مجھ پر ذرا بھی اعتماد نہیں کرتی۔ وہ بات بات پر مجھے جاہل اور بزدل ہونے کے طعنے دیتی ہے مگر میں حیران ہوں کہ کیا ماں کا حکم ماننا بزدلی اور جہالت ہے ؟ اس صورت میں جب ان کے کسی حق پر کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ جو بھی

جبر و ظلم کیا گیا ہے وہ میری ذات سے ہے اور میں سزا بھگت رہا ہوں۔"

"زیادتی — تو آپ کہہ رہے ہیں محترم ! اپنی بیوی سے پوچھیے کہ اس نے کیا کچھ کھویا ہے — کہتے ہیں سوکن تو نمک کی بھی بُری — اور — یہاں تو آپ جیتی جاگتی عورت لے آئے — حد ہو گئی۔"

بہرحال ان سے بحث کے بعد میں ان کی بیوی سے ملی۔ وہ اسی طرح شگفتہ، اپنے بچوں میں مصروف، سیدھی سادی گھریلو بیوی کے روپ میں نظر آئیں، ہمیشہ کی طرح —

"آپ کے میاں نے یہ حرکت کیوں کی ؟"

وہ ہنسیں اور بولیں :

"میری بدقسمتی !"

"مگر آپ نے اس بدنصیبی سے لڑائی نہیں کی ؟"

"کی تھی —"

"پھر — ؟"

"آپ دیکھ رہی ہیں ہتھیار ڈال چکی ہوں کہ مرد انتہائی ظالم ہے، یہ اپنی بیوی سے زیادتی کرتے کرتے یہ نہیں سوچتا کہ اس نے چار پھولوں سے بچوں پر بھی کیا ظلم ڈھایا ہے مگر خدا ظالم کو ایسا بدلہ دیتا ہے کہ وہ خود پناہ تلاش کرتا ہے اور اسے کہیں نہیں ملتی۔"

"یعنی ؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"وہ جو دوسری بیوی تھی۔ یہ نکاح کر کے ماں کے پاس چھوڑ آئے تھے کہ لیجیے آپ اپنی ناک اونچی کر لیں اور مجھے اب کچھ نہ کہیں۔ پھر یہ نکاح کے بعد کبھی اس سے نہیں ملے — نہ تعلق نہ واسطہ — میں بھی مطمئن ہو گئی کہ کیا فرق پڑتا

ہے اس نکاح سے — میرے اپنے گھر میں میرے بچے ہیں۔ شُسر میرے پاس میرے طرف دار ہیں۔ میری نندیں میرا نام لے لے کے جیتی ہیں۔ میرے دیور، میرے جیٹھ میرا دم بھرتے ہیں ۔ مجھے اس کی کیا پرواہ — مگر تکلیف اس وقت ہوئی جب اس نکاح سے پونے دو برس بعد وہ محترمہ ایک بچے کی ماں بن گئیں۔"

"یعنی — ناجائز ؟"

"قطعی !"

"پھر انھوں نے طلاق کیوں نہ دی ؟"

"خاندان کی شرافت آڑے آ گئی۔"

"یعنی ؟"

"بھائی اور ماں باپ کہتے ہیں اس بچے کو اپنا نہ کہا تو لوگ کہیں گے اس شریف خاندان میں حادثہ کیسے ہوا، اور یوں شرافت و نجابت اور وقار کو قائم رکھنے کے لیے حرامی بچے کی پیوندکاری بھی برداشت کرنا پڑی۔"

"مگر یہ سب خود انھوں نے کیسے برداشت کر لیا ؟"

"اسی روز سے تو دل کا عارضہ لاحق ہے ۔ ہر وقت سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ میرا گھر مجھے اجنبی لگنے لگا ہے۔ خود میں بھی سوچتی ہوں۔ ماں کا حکم مانا تھا کہ ان کے پیروں میں جنّت ہے مگر ہم پر یہ کیسے دوزخ کا دروازہ کھل گیا۔ اس بیوی کی حیا بھی جاتی رہی ہے۔ اسے پتہ ہے جنھوں نے ایک بچہ قبول کر لیا ہے وہ دوسرا ابھی قبول کر لیں گے اور مجھے صرف یہ روگ کھائے جا رہا ہے کہ میرے بچوں کا مقابلہ کس ناجائز بچّے سے آن پڑا ہے۔ میرے بچّے بے چارے احتجاج نہیں کرتے مگر بیسویں صدی کے بچّے ہیں وہ سارا مسئلہ سمجھتے ہیں اور مجھے دکھ ہے کہ میرے بچّے بے غیرت خاندان سے ہیں۔ کئی بار جی چاہتا ہے کہ بچوں کو زہر دے دوں — سچ میں ذہنی طور پر

خاصی منتشر رہنے لگی ہوں۔ کیا خبر کسی دن یہ حادثہ ہو ہی جائے۔"

"کیا آپ اپنے میاں سے لڑی ہیں؟"

"میں نے مشرقی عورت کی طرح زہر کھا کے سو رہنے کا نسخہ آزمانا چاہا تھا، پھر ان بچوں کا خیال آگیا۔ ویسے کیا پتہ کسی روز ۔ ۔ ۔ ۔"

اور میں کانپ کر رہ گئی۔

کیا اس خاندان کو بے غیرتی کا لقب دینے والا ۔ یہ مرد تھا ۔ یا ۔ وہ عورت ۔ ؟

بیوی کا تو کہنا تھا یہ سب کچھ میری بد دعا کا اثر ہے جو ان کی آئندہ نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔

مردوں کے معاملے میں مجھے ایک اور اونچے گھرانے کی دلہن یاد آگئی جو شادی کے دوسرے روز اپنی سہیلیوں کو "رات کی بات" بتاتے ہوئے بولی:

"میری ساس کا خیال تھا کہ میں دلہا کی جگہ دوسرا امرد قبول کر لوں گی ۔ مگر میں بستر سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی ۔ اور ۔ اپنی ضد پر قائم رہی ۔ اپنی سہاگ رات میں نے ٹھٹھرتے ہوئے باتھ روم میں بسر کی۔"

"مگر ۔ وہ خاندان اتنا ذلیل کیوں ہے؟"

"ساکھ تو اتنی بلند ہے۔"

"دولت کا تو ٹھکانا نہیں۔"

سہیلیاں ایک سے ایک بڑھ کر بولتی چلی گئیں۔

"دولت ہی کے لیے تو عزت میں سیندھ لگوا رہے تھے ۔ ماں کا خیال تھا کہ گھر میں دودھ ہو تو جاگ کی پھٹکی دوسروں سے مانگ کر بھی دہی جمالیا جا سکتا ہے ۔ مگر ۔ میں ان کا خواب چکنا چور کر کے چلی آئی۔"

یعنی بیوی وہ بھی تھی جس نے خاوند کو ناجائز بچے کا تحفہ دیا۔ انتقاماً —
اور بیوی یہ بھی ہے کہ سسرال والوں کی مرضی کے باوجود دوسرے مرد کے ساتھ چند گھڑیاں نہ گزار سکی۔

اسی ضمن میں ایک اور خاتون سے بات ہوئی تو وہ بولیں :

"میری ایک عزیزہ تھیں — بدقسمتی سے ان کے میاں "نامرد" تھے مگر وہ شرافت کی ماری چپ ہو رہی — اور مرد سے جسمانی رشتے کی بجائے ذہنی رشتہ استوار کر بیٹھی — دونوں کی بڑی خوب گزر رہی تھی مگر ماں بہن کو یہ احساس مارے جا رہا تھا کہ اس بانجھ عورت کو گلے کا ہار بنا رکھا ہے دوسری شادی کیوں نہیں کرتا — دس برس گزر گئے۔ آخر بیوی نے خود ہی میاں سے کہا :

"بھئی جائیے — شادی کر لیجیے — تا کہ انھیں سمجھ تو آئے کہ میں کس طرح آپ سے گزارہ کر رہی ہوں۔"

میاں نے بھی ماں بہن سے انتقام لینے کی خاطر شادی کر لی۔ ماں بہنیں وہ لڑکی کہیں سے خرید کر لائی تھیں۔ اب لڑکی واپس نہ جا سکتی تھی۔ بیچاری گھٹ گھٹ کر بیمار رہنے لگی۔ ساس تعویذ گنڈے کرواتی۔ دائیوں کے پاس علاج کے لیے لے کر جاتی۔

دائی تنہائی میں دیکھتی اور باہر آ کر ساس کو یقین دلاتی :

"دلہن ٹھیک ٹھاک ہے — جلد گود ہری ہو جائے گی۔"

تعویذ والوں کے پاس جاتی تو وہ یقین دلاتے :

"اسے تو کسی نے کچھ کر دیا ہے — کچھ کھلا دیا ہے — تا کہ یہ بے اولاد ہی رہے۔"

ساس طیش میں آجاتی :

"یہ پہلی سوکن کا کیا دھرا ہے۔"

اور وہ بے چاری خواہ مخواہ ہی زیرِ عتاب آ گئی۔ اور ابھی یہ جھگڑے چل ہی رہے تھے کہ میاں چل بسا۔

خاوند کے مرنے کے بعد وہ پہلی خاتون تو اپنے گھر اپنے منصب پر ٹھیک ٹھاک بیوگی کے دن کاٹ گئی۔

مگر — وہ قبیلے کی خاتون — بے چاری جوگیا کپڑے پہن کر مٹی کا پیالہ لے کر میاں کی قبر پر جا بیٹھی اور سارا دن تلاوت کرتی رہتی۔

کہنے والی کہتیں :

"اسے سایہ تھا جبھی تو بے اولاد رہی اور اب جوگن بن گئی۔ کسی پری کا سایہ تھا جو اسے یوں ویرانے میں لے آئی۔"

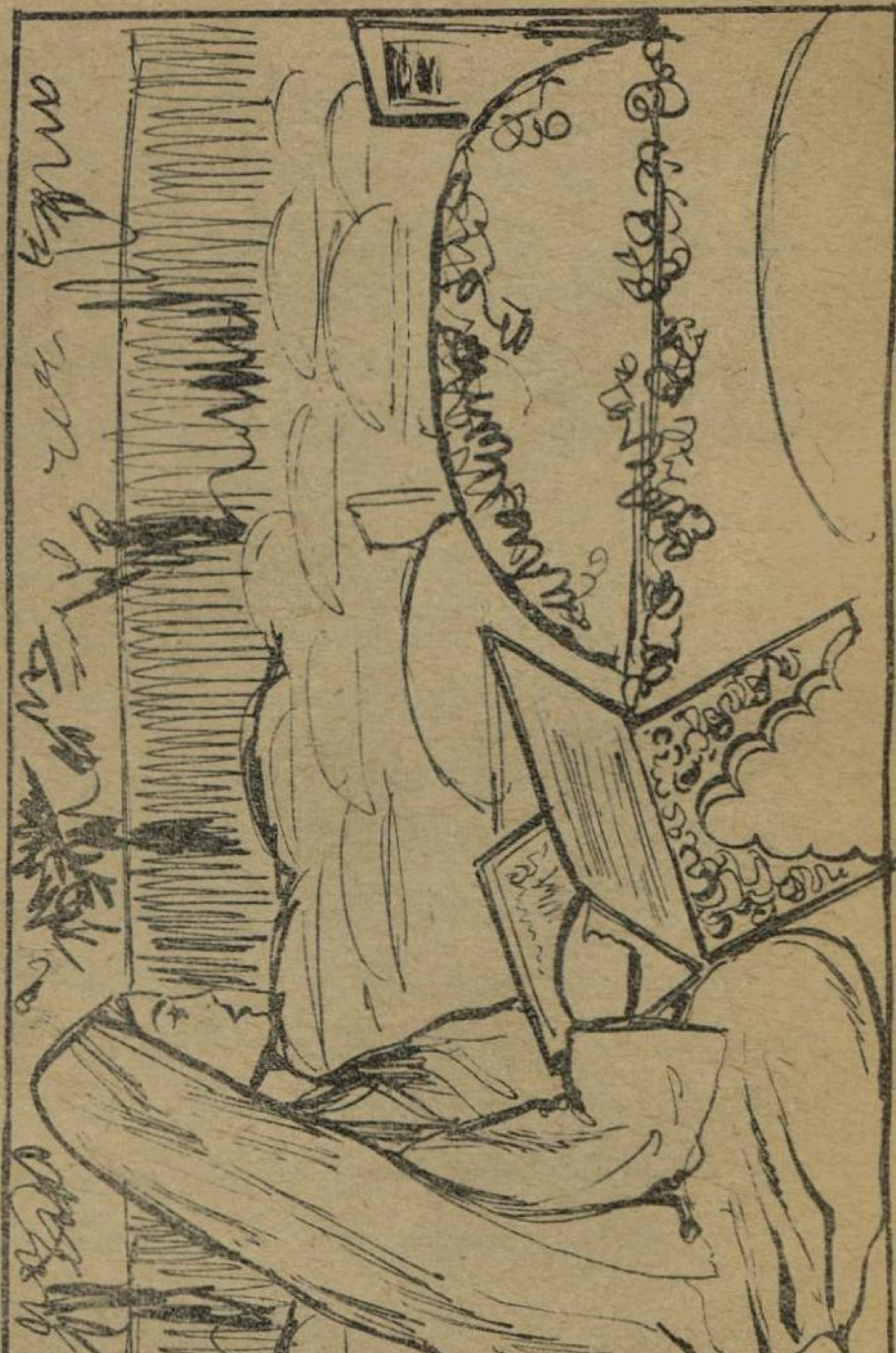
تو ہمارے معاشرے میں مرد کے گھر والوں کا یہ خیال کہ ان کا بیٹا تندرست اور ہر طرح سے فٹ ہے۔ اچھا نہیں۔ انھیں اپنے بیٹے کا نقص بھی ذہن میں رکھنا چاہیے تاکہ بیویوں کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔

اکثر جگہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیویاں اگر تو شریف ہیں تو چپ چاپ رہتی ہیں ورنہ جب گھر والوں کا رویّہ دیکھتی ہیں کہ انھیں اولاد نہ ملی تو اس پر سوکن لے آئیں گے تو وہ "صاحبِ اولاد" ہو جاتی ہیں۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ دادی اماں بچے کو گود میں بٹھا کر پھولے نہیں سماتیں مگر میاں بیوی کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔

ایسی ہی ایک خاتون سے میں نے پوچھا :

"آپا! سنا ہے آپ کی ساس نے آپ کو بہت تنگ کیا جب کہ دائی — یا



لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلو تو آپ چپ چاپ چلی گئیں "۔

" تو پھر کیا کرتی ۔۔۔ اندر جا کر میں نے ازار بند میں بندھے دس روپے لیڈی ڈاکٹر کو دیے اور کہا میرا بھانڈا نہ پھوڑنا ۔۔ اس نے روپے واپس کر دیے اور کہا آپ سی بہو کے تو ان کو پاؤں دھو دھو کر پینا چاہئیں ۔۔ پھر باہر نکل کر اس نے اماں جی سے کہا :

" جا اماں ۔۔ جا کر اپنے بیٹے کا علاج کرا ۔۔ ورنہ اسے طلاق دلوا دے۔ کہاں مصیبت میں پھنس گئی ہے ۔"

تو بس اس روز کے بعد انھوں نے دوسری بات نہیں کی "۔

" مگر آپ نے اپنے میاں سے بات کی ؟ " میں نے پوچھا

" بات کی ضرورت ہی کیا ہے بلکہ ہم نے تو دنیا جہان کی باتیں کی ہیں ۔ اگر اس میں کوئی نہیں کی ۔۔ تو بس ہی ۔۔ کیا تم یقین کر سکتی ہو ؟ کہ جس طرح آج سے اٹھارہ سال قبل میں کنواری بیاہی گئی تھی ۔۔ ہنوز اسی طرح ہوں اور میں بڑے فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھے آج تک کبھی کسی مرد کا ہاتھ بھی نہیں لگا "۔

" میں نے سنا ہے کہ آپ کا گھر بہت پُرسکون ہے "۔

" اور وہ انتشار کا معاملہ ہی کیا ہے ہم بڑے پُرسکون ہیں ۔ میرے میاں میرے کپڑے ، زیور ، میرے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔۔ رشتہ داروں میں ملنا برتنا میں بڑے کھلے دل سے کرتی ہوں "۔

" آپ میں کبھی لڑائی جھگڑا بھی ہوا ؟ "

" ہاں ۔۔ کیوں نہیں ۔۔ بھئی ہم میاں بیوی ہیں ۔ ایک گھر کی ذمہ داریاں مجھ پر اور اس پر ہیں ۔ کئی بار لڑائی جھگڑے کی نوبت آئی ہے ۔۔ بس ہم اسی طرح زندگی

گزار رہے ہیں جیسے دوسرے بیاہے لوگ ۔"

"آپ کو اپنے خاوند سے پیار ہے ؟"

"بے حد — اسے کبھی سر درد بھی ہو جائے تو میں ساری ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی ہوں —"

"انھیں بھی آپ سے پیار ہے ؟"

"ہاں — انھوں نے ہمیشہ میری ہر معقول بات مانی ہے اور میری ذرا سی تکلیف پہ پاگل ہوئے پھرتے ہیں"

میں نے کئی ایسے بھی وسیع القلب ونظر اور وسیع الظرف مردوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ اپنی اس بیوی سے بھی پیار کر سکتے ہیں جس نے ماضی میں محبت کی ہو مگر اب وہ اسے بھول کر صرف انہی کی ہو کر انھیں اپنا حقیقی پیار دے سکے — اس کے برعکس وہ عورتیں تو ستر اسی فیصد کے حساب سے مل جائیں گی جن کے خاوند ظاہراً در پردہ اور دھوکے سے دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات استوار کیے بیٹھے ہوں ان میں وہ مرد بھی ہیں جن کا تعلق یا دوستی صرف ایک لڑکی ایک عورت سے نہیں بلکہ — وہ گھاٹ گھاٹ پھرنے کے مریض ہیں جن کی دنیا محض جسم کے کنوئیں میں بند ہے اور وہ مینڈک کی طرح اس میں ڈوب کر عیاشی کی سطح سے باہر اور زندگی کی صاف ستھری گہرائیوں میں جھانکنے کی فرصت ہی نہیں پاتے ۔

ایک دن میں ایک محترمہ کا سفری سہارا لیے بیٹھی شاپنگ کے لیے — جو اپنے "بوائے فرینڈ" کے ساتھ پکچر جا رہی تھیں ۔

کار میں بیٹھتے ہی میں نے ماحول کا اچٹتا سا جائزہ لیا اور ان محترم کو جو اچھی خاصی عمر کے گزیٹیڈ آفیسر اور چند بچوں کے باپ تھے سے پوچھا :

"ان دنوں آپ کا کون سا بچہ علیل ہے ؟ اور اسے کیا ہے ؟"

"ارے تم صحافی اور افسانہ نگار لوگ علم غیب سے بھی شغف رکھتے ہو۔؟" انھوں نے سٹیرنگ وہیل سے نظریں ہٹا کر گردن کو قدرے خم کر کے پیچھے مڑ کر مجھ سے کہا اور پھر بولے :

"رفعت بہن ! واقعی میرے دونوں چھوٹے بچے بیمار ہیں۔ ننھا تو خاصا کمزور ہے گھر سے ان کی دوا ہی لینے نکلا تھا کہ . . . . . .؟"

"وہ دوا آپ کی عیاشی کی نذر ہوگئی۔" میں نے ان کی گرل فرینڈ کی سینڈل تلے کچلی ہوئی دوا کی پڑیوں کی طرف اشارہ کر کے مزید کہا :

"آپ سیدھے گھر کیوں نہ گئے ؟"

"دراصل رفعت میرا گھر، میرا قید خانہ ہے۔ اَن پڑھ بیوی جہنم سے کم نہیں۔ گھر کا ماحول تو مجھے بچوں سے بھی بیزار کر دیتا ہے۔ اسی لیے سوچا تھا پکچر دیکھ کر دیر سے گھر جاؤں گا۔ وقت سے پہلے گھر جا کر بور ہونے کو جی نہیں چاہتا۔"

"آپ کی بیوی اَن پڑھ ہے مگر کیا وہ آپ کی دلچسپی کی مستحق نہیں ؟ آج کل بچوں کا مرض ہی کون سا کم ہے۔ آپ دونوں اس بات پر تبادلہ خیالات کیجیے۔ آخر آپ اپنی بیوی کو ٹھیک کیوں نہیں کرتے ؟"

"وہ ۔ میری بیوی دراصل ٹھیک ہونا نہیں چاہتی۔"

"آخر کیوں ؟"

"وہ اَن پڑھ ہے اس لیے انتہائی ڈھیٹ اور اکھڑ ہے۔"

"یہ بات تو غلط ہے ۔ کئی تعلیم یافتہ خواتین بھی بڑی اکھڑ، ضدی اور ڈھیٹ ہوتی ہیں ۔ مگر آپ کی بیوی نے کیا ڈھٹائی کی ؟"

"وہ اپنے آپ کو بدلنا نہیں چاہتی۔"

"تو معاف کیجیے قبلہ ! برائی کی جڑ آپ ہیں ۔ یوں کہیے وہ آپ کو پسند نہیں

آتی — حالاں کہ عورت تو اپنے من بھا جانے والے مرد کے لیے گھر بار، والدین بلکہ بچے تک چھوڑ کر اس کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ کی بیوی آپ کی پسند کے مطابق نہ ڈھل سکی۔ لگتا ہے آپ نے اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہی نہیں کی — اور — وہ اب آپ سے چڑ گئی ہے۔"

انھوں نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔

میں بولتی چلی گئی :

"آپ کے والدین نے یہ زیادتی کی کہ آپ کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کو نظر انداز کر کے اَن پڑھ بیوی بیاہ دی — مگر آپ خود اپنی بزدلی اور سعادت مندی کے جرم کی سزا معاشرے کے مستقبل کو دے رہے ہیں۔ آپ کے پیار سے محروم بچے اور خاوند کی توجہ کو ترستی ہوئی عورت معاشرے کو قطعی نئے ذہن کی تخریب پسند نسل مہیا کریں گے — آپ کو کم از کم اپنے بچوں پر ضرور توجہ دینی چاہیے۔ وہ آپ اور آپ کی بیوی کا مشترکہ مرکز ہے۔ آپ کی بیوی خود بخود آپ میں دل چسپی لینے لگے گی۔ مجھے تو کچھ یوں احساس ہو رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو آپ کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتی ہے۔ آپ اس کا احساسِ کمتری دور کرنے کی بجائے اس پر اپنی شخصیت ٹھونستے رہتے ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ انھیں اپنی پسند کے لباس پہنا کر اپنے دوستوں اور ان کی بیویوں کے سامنے لائیں۔ اسے احساس دلائیں کہ بحیثیت بیوی آپ اس کی قدر کرتے ہیں۔ پھر دیکھیے وہ کیسے ٹھیک نہیں ہوتی — میں یہ حقیقت بھی تسلیم کرتی ہوں کہ آپ کے سائے میں اس کی صلاحیتیں بجائے پنپنے کے اور بھی دب گئیں۔ وہ اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھی۔ آپ اس کے اندر دھیرے دھیرے خود اعتمادی پیدا کر کے اس کی صلاحیتوں کو بیدار کیجیے۔ آپ اسے "ضدی" کہہ کر اپنے اس جرم پر تو پردہ نہیں ڈال سکتے کہ آپ نے اسے توجہ کے

قابل ہی نہیں سمجھا - پہلے ہی دن سے جب اس نے دیکھا کہ زندگی کے بازار میں وہ آپ سے قدم ملاکر نہیں چل سکتی تو اس نے اپنی انا کی تسکین کے لیے اپنی روش کو مضبوطی سے تھام لیا -

آپ نہیں جانتے بھائی ! یہ عورت اپنی برتری کیسے کیسے منواتی ہے پرانی روش سے نکال کر جدید مزاج کے مطابق ڈھالنا آپ کا کام تھا آپ نے اس کی زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے کوئی تدبیر تو آزمائی ہوتی — اب بھی آزمایئے " !

پکچر اور شاپنگ کا پروگرام تو کہیں دور رہ گیا تھا - بچوں کی مزاج پرسی کر کے جب ہم پلٹے تو ان کی گرل فرینڈ کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے میرے لیے — مگر میں انھیں نظر انداز کر کے مطمئن سی ہو کر جدید دور میں خواتین کے کردار پر بحث کرتی رہی -

اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرے کی قدریں بدل گئی ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ نئی قدروں کو محض برائی بنا لیا گیا ہے -

اور ایسی خواتین اس وقت یہ سوچ بھی نہیں رہیں کہ اگر مرد اپنی ان پڑھ منکوحہ سے بیزار ہے تو تمھیں دوست بنا کر کون سی عظمت کا تاج پہنا رہا ہے مگر کم ظرفی یہ ہے کہ دوست بننے میں عار محسوس نہیں کی جاتی اور اپنی ہی صنف پر ظلم ڈھاتی اور دوش مردوں کی سیلانی اور رنگین فطرت کو دیتی ہے -

یہ تو ایک مرد ہے جس نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ورنہ اکثر خواتین گھروں میں بیٹھی کڑھتی ہوتی ہیں اور مرد باہر رنگ رلیاں منا رہے ہوتے ہیں - اس سلسلہ میں سب سے بڑا بہانہ شہر سے باہر " بزنس ٹور " کا ہوتا ہے یا دوستوں کی محفل میں ذرا گپ بازی کا -

اسی طرح کی ایک گرل فرینڈ نما داشتہ طرز کی خاتون سے میں نے پوچھا :

"تم نے اپنے مستقبل کے لیے کیا سوچا ہے ؟"

"وہ بہت جلد مجھ سے شادی کر رہا ہے۔"

"تم گزشتہ چار برس سے یہی کہہ رہی ہو — اور ایک بار تو تم نے . . . ."

"ہاں — ہاں میں نے بہت سی سلیپنگ پلز کھالی تھیں اور اس واقعہ کے بعد سگریٹیں بھی پینے لگی ہوں — مگر بات یہ ہے کہ وہ شادی نہ کرنے پر مجبور رہے۔ اور مجھے اس پہ ترس آتا ہے۔ اس کی بیوی بڑی جاہل ہے اور کمینی — اسے دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتی — دوسری بات یہ کہ اس کی اولاد اب جوان ہے اور . . . ."

". . . اور تم اسی بھڑوں کے چھتے میں سکون تلاش کر رہی ہو مستقبل کا ؟"

"دراصل — اب سب پر ظاہر ہے کہ میں اس کے ساتھ رہتی ہوں۔ شروع میں اس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ شادی اگلے ماہ کر لیں گے۔ اس نے مجھے چھ ساڑھیاں اور زیور کا سیٹ بھی لے کر دیا تھا — مگر میری بدنصیبی کہ اسی ماہ — ان کی نوکری پر الزام لگا اور یہ بیکار ہو گئے . . . . بات عام ہو چکی تھی — اب میں واپس کہاں جاؤں !"

"مگر تم کبھی اس کی بیوی سے ملی ہو ؟"

"نہیں ! وہ اپنے قصباتی مکان میں رہتی ہے۔"

"ان کے بچوں کو ملی ہو ؟"

"ہاں وہ یہاں آتے ہیں تو ملی ہوں مگر وہ بھی بڑوں کے سکھائے ہوئے۔ مجھ سے گھلتے ملتے نہیں — بہرحال جس دن بھی میں قانونی طور پر گھر آ گئی، تو خود بخود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"اور جب تم پر کوئی اور آ گئی تو ؟"

"یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں ؟"

"وہ مجھے کیسے چھوڑ سکتے ہیں ؟"

"جیسے وہ چھ بچوں کی ماں پر تمھیں لانا چاہتے ہیں۔"

"مگر وہ ان پڑھ ہے۔"

"اور تم میں اگر یہ نقص نظر آ گیا — کہ — بڑی تیز ہے اور ملازمت کرتی ہے — تب ؟"

"تو میں ناکوں چنے چبوا دوں گی۔"

"تم — ؟"

"ہاں — میں !"

"مگر تم ابھی تک اسے نکاح کر لینے پر تو مائل کر نہیں سکیں۔"

اور وہ خاتون جھینپ کر رہ گئیں۔

مگر ایک خاتون ذرا اس سے بھی آگے بڑھ گئیں۔ انھوں نے چار بچوں کے باپ سے شادی رچا ہی لی۔ مرد نے شادی کے لیے شرائط بڑی کڑی رکھیں کہ — :

پہلی بیوی ہی گھر کی سربراہ ہوگی۔

تمھیں گھر کا کام کرنا پڑے گا۔

بڑی بیگم کے پاس پیسہ ہوگا اور تمھیں ان سے اپنے اخراجات طلب کرنے ہوں گے۔

بچوں سے پوری طرح پیار و محبت سے رہنا ہوگا۔

یہ فضائی میزبان لڑکی ان ساری شرائط پہ دستخط کرتے کرتے نکاح نامہ پر بھی دستخط کر گئی۔

پہلی بیوی سے ملاقات ہوئی۔
تو وہ سنجیدہ سی محزون عورت نکلیں۔
بولیں :

"میں نے اپنے جہیز کے بھاری جوڑے اور ساڑھیاں بیچ بیچ کر اپنے خاوند کو پڑھنے کے لیے فیسیں دی تھیں۔ میرا خیال تھا یہ اعلیٰ افسر لگے گا تو ہمارے دن پھر جائیں گے ۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ ان کا اعلیٰ مرتبہ میرے لیے بدقسمتی ثابت ہوگا اور انھیں کوئی اور پھانس لے گی۔"

مگر اس صبر کی پتلی نے خاوند کی شادی بڑی ہمت سے کی اور سوکن کو بیاہ کر گھر لے گئی۔

چند ماہ بعد ان کے گھر کا نقشہ بدلا ہوا تھا کہ دوسری بیوی اس ماحول میں گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ گھر کا کام کرتے کرتے وہ تھک چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پیسہ تھا ۔ نہ گھر کی حکومت ۔ اپنی پہلی زچگی کے دوران وہ بیمار ہوئی اور بستر سے لگ گئی۔

پہلی بیوی تیمارداری کرتیں۔
اور ۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتیں :
"کبھی کسی مظلوم کو نہیں ستانا چاہیے۔"
"کسی کے گھر کے سکون کو کبھی نہیں لوٹنا چاہیے۔"

اور پھر دوسری بیوی بیماری ہی کی حالت میں میکے واپس آ گئیں کہ اس میں نہ تو پہلی بیوی ایسا صبر تھا ، نہ گہرائی ۔ وہ مرد کی چند ہمدردیوں پہ اسے

دیوتا سمجھ بیٹھی تھی۔

مگر جب مستقل رفاقت نصیب ہوئی تو معلوم ہوا — کہ شیشے کے تصوّراتی محل سے یہ کانٹوں کی سیج کوسوں دور ہے۔

اور اب —

نہ جائے رفتن باقی ہے نہ پائے ماندن —

❖

میں نے اوپر کہیں ذکر کیا تھا ایسے مردوں کا جو بیویوں کی گزشتہ بے راہرو زندگی کو بھلا کر انھیں شریف گرہستی بنانے میں کھلے دل سے تعاون کرتے ہیں، اور کامیاب رہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں علاوہ ازیں پڑھے لکھے لوگوں کو مجھے ایک جوڑا کبھی نہیں بھول پاتا جو ایک دن اخبار کے دفتر میں میرے پاس آیا۔

کالے رنگ کا مرد جس کا اوپر والا ہونٹ کٹا ہوا تھا (گرہن زدہ) میلے جیکٹ کپڑے ۔۔ اس کے ساتھ ایک خاتون تھی ریشمی سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی ۔۔ بڑی معمولی شکل کی سانولے رنگ کی ۔۔ جس کے چہرے پر اتنی چھائیاں تھیں کہ گالوں کی رنگت خاصی سیاہ ہو چکی تھی ان سے ۔۔ ہاتھوں کا رنگ زردی مائل ۔۔ سراپا ۔۔ بظاہر لمبا قد، بھاری کولہے مگر مجموعی تاثر جیسے عورت نے کسی طویل مرض سے صحت پائی ہو۔ اب نہ صحت مند اور نہ بیمار ۔۔

مجھے اس جوڑے میں کوئی خاصیت نظر نہ آئی۔ میں نے سمجھا مرد بے روزگار ہوگا اور دونوں اپنے بچوں کے لیے اپیل چھپوانے آئے ہوں گے مدد کی۔ مگر مرد نے قدرے جھینپ کر اپنے آپ کو بات کرنے کے لیے تیار کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز یوں کیا :

"چار روز قبل میں نے اس سے شادی کی ہے۔ یہ شریفانہ زندگی



بسر کرنا چاہتی ہے اسی لیے یہ از خود "بازارِ حسن" سے میرے ساتھ بھاگ کر آئی ہے۔"

"بازارِ حسن ؟" میں چونک اٹھی۔

میں نے اس میلی کچیلی خاتون کو دوبارہ دیکھا اور سوچنے لگی :

ہوں — تو "بازارِ حسن" میں "حسن کے یہ خرابے" بھی پائے جاتے ہیں۔ اور — یہ کہ سنا تو یہ جاتا ہے لڑکیاں گھروں سے بھاگ آتی اور بازارِ حسن کی زینت بن جاتی ہیں — مگر یہ بازارِ حسن سے بھاگ آئی — حیرت ہے !

میں نے اس بی بی کے لیے چائے کا آرڈر دیا اور اسے سکون سے بیٹھنے کا مشورہ دے کر پوچھا :

"مگر اب آپ لوگوں کو کیا مسئلہ درپیش ہے ؟"

"اب وہ لوگ جو میری کمائی پہ گزارہ کرتے تھے وہ مجھ پہ چوری کا الزام لگا کر مجھے واپس جانے پہ مجبور کر رہے ہیں۔ پولیس ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ ہماری جھونپڑی کو کل گرا گئے ہیں۔ میں آپ کے پاس آئی ہوں کہ شریفانہ زندگی بسر کرنے میں خدا کے لیے میری مدد کریں میری کہانی اخبار میں چھاپ دیں تاکہ بہت سے لوگ اسے پڑھیں اور سب میری حفاظت کریں — مجھے اس بازار — اور — پولیس سے بچا لیں —"

خاتون رو دی۔

پھر چائے پینے کے دوران ہی اس خاتون نے اپنی ساری داستان سنا ڈالی :

وہ عام گھرانے کی شریف لڑکی تھی۔ دور مقام کے کسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کا خاوند اس شہر میں ملازمت کرنے آیا تھا مگر بُری صحبت نے اسے اپنی بیوی کو بُرے لوگوں کے پاس بیچ دیا — وہ بہت روئی — بہت چلائی — بلکہ اس خاتون کے کوٹھے میں قید ہو کر واویلا اور بھی بڑھ گیا — اس نے اسے آرام سے سمجھایا کہ ہم نے تجھے تیرے خاوند سے چار سو کے عوض خریدا ہے۔ تیرے خاوند نے تیرے گھر خط لکھ دیا ہے کہ وہ بس کے تلے آکر مر گئی ہے۔ ہسپتال والے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ چند روز بعد جب تیرے میکے سے کوئی روتا پیٹتا آئے گا تو اسے کسی قبرستان میں کوئی سی گیلی قبر دکھادی جائے گی — اس لیے — تُو — جو باہر کی دنیا میں تھی — مر چکی ہے — اب تُو یہاں ہے میرے گھر میں — یہاں تجھے نئی زندگی گزارنا ہے — جیسے اور لڑکیاں یہاں کر رہی ہیں تجھے بھی ایسے ہی کرنا ہوگا۔

میرے مسلسل انکار پر مجھے برہنہ کر کے پولیس والوں نے مارا — جانے میں کتنے دن تک مار کھاتی رہی — پھر چرس، بھنگ اور دیسی شراب کی عادت پڑی اور اسی حالت میں میں نے پیشہ شروع کر دیا مگر مجھے وہ زندگی نہیں پسند — میں اچھی بیوی بننا چاہتی تھی اس لیے ہمیشہ اس زندگی کو ترستی رہی۔ میں پچاس روپے سے سو روپے تک میں بکی ہوں۔ مگر ہر مرد کے پاس جا کر میں نے اس کے پاؤں پکڑ کر یہ ضرور کہا ہے:

"مجھے یہاں سے باہر جانے کا راستہ دکھا دو — مجھے اپنے کسی نوکر کے لیے لے جاؤ — میں شادی کر کے گھر بسانا چاہتی ہوں"۔

مگر کسی مرد نے کبھی میری ان دکھی باتوں پر دھیان نہ دیا۔سبھی نے میری التجاؤں کو شراب کے نشے میں قہقہوں میں اڑا دیا۔

میں نے زیور — ریشمی کپڑے پہنے ہیں مگر میں زیور اور ریشم پہن کر ہمیشہ روئی ہوں۔

اس مستری نے بھی مجھے چند روپوں میں کئی بار خریدا تھا۔میں نے اس کے پاؤں پکڑ کر بھی التجائیں کیں۔واسطے دیے اور آخر اسے میری حالت پر ترس آ ہی گیا — تین مہینے کے عرصے میں کئی بار میں اس کی حفاظت میں گلبرگ اور ممن آباد کی کوٹھیوں میں راتیں گزارنے کے لیے بھیجی گئی ہوں — کیوں کہ یہ ان کے بڑے بھروسے والا بن گیا تھا۔

اس کے گھر آ کر سب سے پہلے میں نے اس کی ماں سے مانگ کر پھٹے ہوئے کپڑے پہنے — اور پھر — نکاح کے وقت ایک ہمسائی نے مجھے صاف دوپٹہ دیا اوڑھنے کو —

اب میں شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں بیوی بن کر۔"

میں نے اس کے خاوند سے پوچھا :

"کیا دوسرے ایسے لوگوں کی طرح آپ کل کلاں کو اسے مجبور تو نہ کریں گے کہ وہ آپ کی کمائی کا ذریعہ بن جائے؟"

اس گندے مرد نے غلیظ سی مسکراہٹ بکھیر کر کہا :

"یہ عورت اب کسی جھانسے میں آنے والی نہیں۔"

اور اس کا یہ اعتماد صحیح ثابت ہوا۔

اس خاتون کو جب محلے اور معاشرے کا تحفّظ ملا تو دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

وہ محلے والوں کی گائے بھینسوں کا گوبر حاصل کرتی، اُپلے بناتی، بیچتی اور گھر کا خرچ پورا کرتی اور اس طرح اپنے خاوند کی کم آمدنی میں اضافہ کر کے اس کی معاون بنتی۔

میں نے اسے شادی کے تین برس بعد تک جب بھی دیکھا سگھڑ عورت کے روپ میں دیکھا۔ پھر ان کی جھگیوں کی جگہ کوٹھیاں تعمیر ہو گئیں اور وہ یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے گئے۔

٭

ایک لڑکی تھی بڑی ماڈرن - گھر والے اس قدر امیر نہ تھے کہ اس کے بہت زیادہ ناز نخرے برداشت کریں اور اسے اپنے حسن کے سنگھار کے لیے نت نیئے لباس اور میک اپ کی ضرورت رہتی تھی - فلم دیکھنے کی رسیا تھی اور اپنی جیب میں اتنے پیسے نہ تھے -

وہ عام متوسط طبقے کی لڑکی تھی مگر ہوسٹل میں رہ کر خرچ یوں کرتی جیسے اس کا باپ بہت بڑا جاگیردار ہو - سب لڑکیاں جانتی تھیں کہ وہ کس دروازے سے یہ سب کچھ حاصل کر رہی ہے - اس کی بے راہروی کے چرچے عام تھے -

انہی دنوں ایک شریف آدمی کی نگاہِ التفات اس پر پڑی - اس کے گھر شادی کا پیغام دیا اور سب حیرت زدہ رہ گئے جب خود اس لڑکی کے اپنے "اعترافات" کے باوجود وہ اسے بیاہ کر لے گیا اس شرط پر کہ آئندہ یہ زندگی بھول جاؤ — شادی کے بعد اس خاتون پر اس کی پابندیاں تو ضرور لگیں اور پابندیاں لگانے میں وہ حق بجانب بھی تھا :

اس کے پرانے دوستوں سے ملنا ملانا یکسر بند —

باہر اکیلے نکلنے پر کڑی پابندی —

گھر آنے والے ٹیلی فونوں کی پڑتال —

اور — مشکوک سہیلیوں کے ملنے اور گھر آنے پر کڑی نگرانی —

خاتون ان باتوں سے گھبرائی تو بہت مگر اپنے خاوند کے بے پناہ پیار میں

سب کچھ برداشت کیے گئی اور اب وہ بڑی ہی پرسکون گھریلو زندگی گزار رہی ہے اپنے بچوں میں —

خود کہتی ہے :

"کبھی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو خود ہی کانپ اٹھتی ہوں۔ اللہ میاں کو میری کون سی نیکی قبول ہوئی کہ مجھے یہ پرسکون زندگی عطا کی۔ میں تو اپنی گزشتہ زندگی کی کبھی بات بھی کروں تو میرے میاں سوچنے بھی نہیں دیتے — حیرت ہے ان کے آئیڈیل کی کون سی جھلک تھی مجھ میں — کہ میری پوری زندگی اپنا کر اپنے سانچے میں ڈھال لی یا ایسا کرنے میں ان کے کس احساس کو تسکین ملی ہے کہ انھوں نے بیوی کو بچوں کی طرح سمجھا سمجھا کر اپنے نظریات کا قائل کیا۔"

اب اس حقیقت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس خاتون نے بھی — اپنے شوہر کے سانچے میں ڈھلنے میں کمال کیا اور افہام و تفہیم کے مرحلے پر بڑی ثابت قدم رہی اور اپنی بے راہ رو زندگی کو پرسکون جنت میں ڈھالنے میں کامیاب ہو گئی —

ایسے مرد اکثر دیکھنے میں آتے ہیں جو برسوں اس تلاش میں رہتے ہیں کہ انھیں ایسی عورت مل جائے جو ان کی آئیڈیل تھی یا واقعی جس کی محبت میں ماں کی شفقت بھی ملی ہو۔

اسی طرح کے ایک صاحب ہیں انھیں خود پیار کی تلاش تھی۔ انہی دنوں اپنی ہم جماعت کی کچھ ادائیں جی کو بھا گئیں۔ فوراً ہی شادی کر ڈالی۔ شروع میں تو اپنے جذبۂ برتری کے زعم میں اس سے پُر شفقت محبت کیے گئے۔ بیوی نے

اٹھلا کر کہا :

"میں تعلیم مکمل کروں گی۔"

انھوں نے فوراً داخلہ بھجوا کر پرائیویٹ کالج میں پڑھنے کا انتظام کر دیا۔

بیوی نے فرمائش کی :

"میں تو علیحدہ گھر بساؤں گی۔"

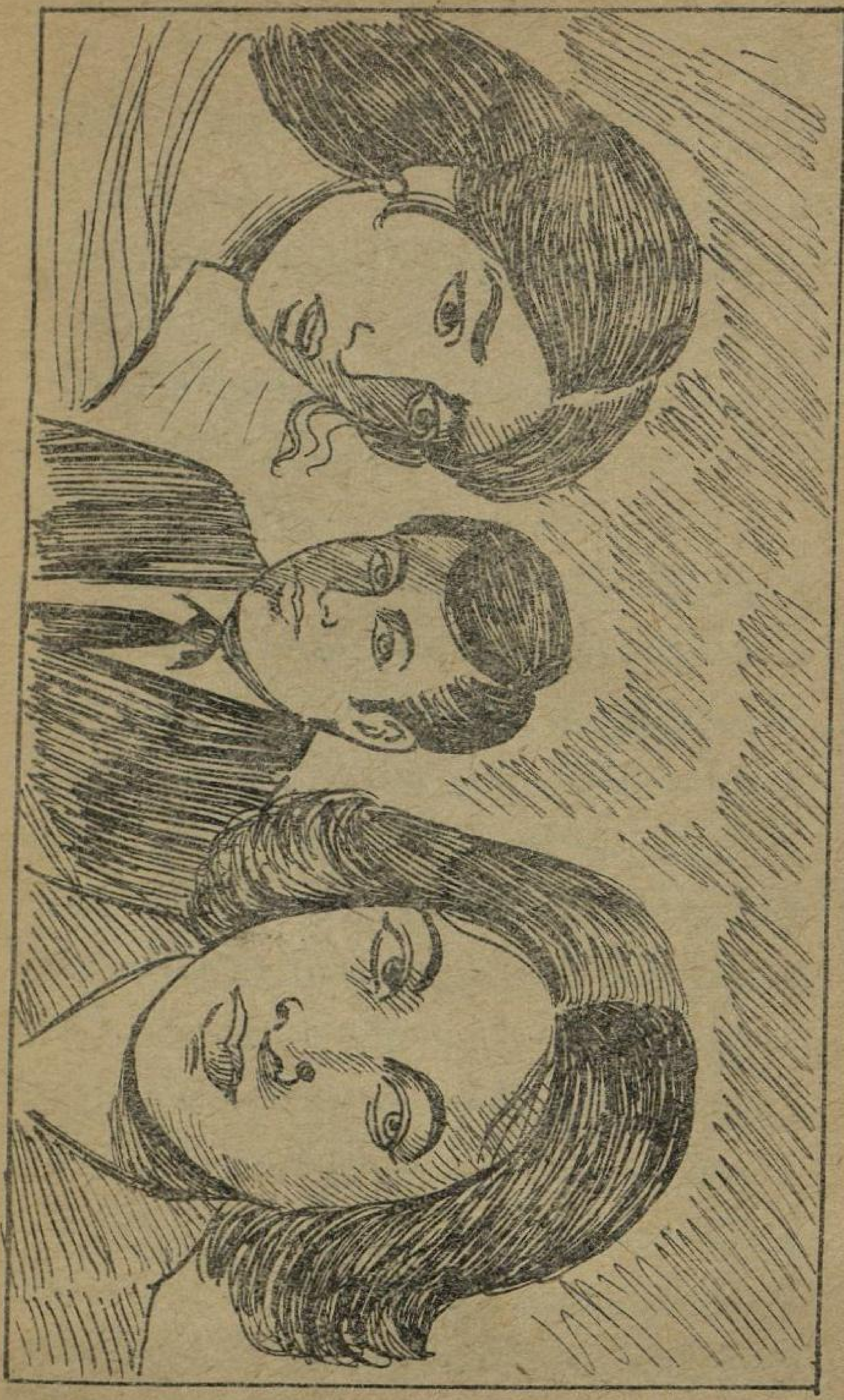
اسی وقت ایک فلیٹ کرایہ پر حاصل کر لیا گیا۔

چھوٹی موٹی فرمائشیں علیحدہ۔

مگر رفتہ رفتہ مسٹر ڈ کو احساس ہونے لگا کہ میری نصف بہتر تو زندگی کی ساتھی بن ہی نہیں رہی۔ اسی احساس نے ماں کی گود یاد دلا دی جس سے باغی ہو کر ایک بچی کو پسند کر کے اس پر اس قدر توجہ دی۔ مگر ذہن کی تھکن بڑھتی چلی گئی۔ اب بیوی کو تو انھوں نے ہمیشہ یہ احساس دلایا کہ اس کی تمام تر ذمہ داری انھوں نے اٹھالی ہے مگر بیوی کچھ ایسے ذہن کی تھی کہ اپنی ذمہ داری نہ پہچان سکی۔ شاید کچھ مطلب پرست فطرت کی تھی اور اپنی ہی ذات کو برتر تسلیم کر چکی تھی کہ شوہر نے اتنی ناز برداری کی لیکن اسے خیال ہی نہ آیا کہ دینے والا بھی کچھ حق رکھتا ہے اس کے الطاف کا شعور چاہتا ہے کہ اسے صلہ ملے مگر وہ محترمہ اپنی ہی دنیا میں مگن، سراپا ناز — نیاز سے قطعی بے پرواہ ——

نوبت یہ ہوئی کہ شوہر ہر اس عورت پر جان دینے لگے جس میں ذرا سا بھی اپنی ماں کا عکس نظر آجائے۔ بیوی اس نفسیاتی پس منظر سے آگاہ نہیں تھی شوہر کو دوسری عورت میں دلچسپی پاتے دیکھتے ہی سیخ پا ہو جاتیں اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگتی روٹھتی اور دنوں تک گھر میں سرد مہری کے بادل چھائے رہتے۔

مجھے اکثر خیال گزرتا کہ یہ عورت اپنے خاوند کا تجزیہ کیوں نہیں کرتی۔ خود اپنی ہی شخصیت میں کیوں ڈوب گئی ہے۔ ڈوبی بھی ہے تو یہ رخ اس کی نظر سے کیوں



اوجھل ہے کہ وہ کیا زیادتی کر رہی ہے یا اس میں کیا کمی آگئی جو اتنا پرستار خاوند یوں خلاؤں میں بھٹک رہا ہے۔

بیویاں اپنے شوہروں پر باہر پھرنے کا الزام تو جھٹ سے لگا دیتی ہیں مگر اپنی کمیوں، اپنی زیادتیوں کا احساس نہیں کرتیں۔ اگر یہ محترمہ اپنے شوہر کے جذبات کا احترام کرتیں اور اسے جواب میں پیار دیتیں تو یہ دنیا ان کے لیے پُرسکون، اور من چاہی جنت بن کر رہ جاتی۔

"احساسِ برتری میں مبتلا لڑکی بھی ڈھنگ کی بیوی نہیں ثابت ہوتی۔ اس میں خود پسندی، نخرہ اور ضد کا عنصر بھی دوسری عورتوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے وہ اپنے خاوند کے اصول، خیال، مذاق، مزاج کا ساتھ دینے میں اپنی بے عزتی سمجھتی ہے اور ہر بات اپنی ہی منواتی ہے۔"

دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب اپنی زندگی کا رونا رو رہے تھے دراصل ان کی بیوی عمر میں ان سے کچھ چھوٹی تھی اور وہ بے خیالی میں بیوی کے سامنے اس بات کا اعتراف بھی کر چکے تھے۔ بیوی پڑھ لکھ کے جاہل ثابت ہوئی۔ بجائے اس کے کہ خاوند کی اگر ایک کمزوری ہاتھ آئی ہے تو کسی وقت کے لیے اٹھا رکھے وہ بات بات پر نخرہ دکھانے لگی۔ پہلے تو میاں جا۔ دبے جا ضدیں پوری کرتے رہے، آخر اکتا گئے۔ کبھی اس کا نفسیاتی پس منظر تلاش کرتے۔ کبھی اپنا تجزیہ کرواتے پھرتے۔ اور یوں زندگی سکون سے تہی اور نفسیاتی تجزیوں میں الجھ کر رہ گئی۔ آخر وہ کہاں تک ساتھ دیتا۔

مرد اپنے آپ کو کتنا بڑا عاشق کیوں نہ ثابت کرے اس کے خون میں محبوبیت کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔

ظاہر ہے وہ اپنی بیوی کے قطعی منفی محبوبانہ رویّے سے بیزار ہو کر امن ڈھونڈ

کی طرف مائل ہو جائے گا جو اسے ذرا سی بھی لپند سے مسکرا کر دیکھ لے۔

ہمارے معاشرے میں اس چیز کا فقدان اکثر گھروں میں بے اطمینانی کا سبب بنتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام نہیں کرتے اگر عام گھروں میں یہ شعور عام ہو جائے تو بگاڑ کی نوبت ہی نہ آئے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں ازدواجی رشتے بھی طے پاتے ہیں۔ دل کے معاملے بھی شادی کی رسم پر آن ٹھہرتے ہیں۔ اگر کچھ نہیں طے پاتا تو یہ ذہنی ناطہ — کہ ہمارے ہاں ذہنی رشتہ کو اہمیت ہی نہیں دی جاتی جو سب سے ضروری اور زندگی کے لیے بے حد اہم چیز ہے۔

ذہنی مطابقت نہ سہی ذہن کو ایک سطح پر ہی ہونا چاہیے کہ آپس کے مزاج سمجھنے میں میلوں کا فاصلہ تو حائل نہ ہو، اور ذرا سی غلط فہمی کو پھیلا کر طلاق کے کاغذ پر ثبت نہ کر دیا جائے۔

✤

ایک اچھی بیوی کی رفاقت میسر آ جانا مرد کی زندگی کی معراج ہے اور اس کی انتہائی خوش نصیبی۔ مگر بے حد حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ سن کر کہ مرد حضرات تو ابھی تک "اچھی بیوی" کا تعین ہی نہیں کر پائے کہ وہ کیسی ہو۔ اور یہاں آن کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے ازدواجی جوڑے چوکور گولیاں ہیں جو گول ہیں تو چوکور خانوں میں ہے اور چوکور ہیں تو گول خانوں میں پڑی ہیں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ گھر میں بیوی کیسی ہی خوب صورت کیسی ہی سگھڑ رہی ہو مرد باہر کی دنیا میں "دل پشوری" ضرور کرتا ہے۔ اعتراض کرو تو جواب ملتا ہے:

"بھئی یہ تو مرد کی فطرت ہے۔"

اور یہاں آن کر بیوی بے حد مشکل میں پھنس جاتی ہے کہ آخر اس مرد سے گزارہ کس طرح کیا جائے؟

ایک خاتون کا کہنا ہے:

"میں اعتراض ہی نہیں کرتی مگر مجھے احساس ضرور ہو جاتا ہے۔ مثلاً جس دن وہ باہر جھک مار کر آئیں تو ان کی آنکھیں مجھ سے ہمہ وقت کھوجتی رہتی ہیں کہ میں نے ان کی پیشانی پر "عرقِ ندامت" تو نہیں دیکھ لیا — مگر میری ہمت — کہ میں نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا — کہ میں سب کچھ جان چکی ہوں — بلکہ اس دن میں اپنی دلداری میں اضافہ کر دیتی ہوں۔ ظاہر ہے وہ ضمیر کی خلش دور کرنے یا اپنے مجرم ضمیر کی تسکین کے لیے مجھ سے

کچھ زیادہ ہی ملائمیت سے پیش آتے ہیں۔ میں اور بھی نیازمند بن جاتی ہوں اور وہ اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ میں ان کی بے جا بے وقت بلکہ خلافِ معمول ملائمیت پر بچھی جاتی ہوں اور میں اس زعم میں ہوتی ہوں کہ :

آ۔ تجھے بتاؤں ۔ عورت کیا چیز ہے ؟

اے مرد ! تو وفا کی تیتلیوں کی پہچان نہیں کر سکتا ۔ اور ۔ میں تیری آنکھوں سے پردہ نہیں سرکاؤں گی بلکہ براہ راست تیرے دل کو ہاتھ میں لوں گی ۔ کیوں کہ عورت جو مقام مرد کے دل میں پیدا کرتی ہے اس کا نقش مرد مشکل سے مٹا سکتا ہے ۔ میں سمجھتی ہوں کہ جیسے ایک مرد گھر میں کھانا کھاتے کھاتے اکتا جاتا ہے اور کبھی کبھی ہوٹل میں یا باہر کسی دوست کے ہاں کھانا کھا آتا ہے ذرا ذائقہ بدلنے کو ۔ تو اس کی یہ عیاشی بھی بس اسی زمرے میں آتی ہے اور میں اپنا فرض جانتی ہوں کہ مرد اگر کھانا باہر کھا بھی لے تو باورچی خانے میں اس کے حصے کا کھانا رکھا رہنے دو۔"

مگر کئی مرد اس خاطرداری سے اور بھی بدک جاتے ہیں ۔

ایک صاحب نے خود اپنا تجزیہ یوں کیا کہ وہ گھر میں اس خیال سے داخل ہوتے ہیں کہ بس ابھی ابھی گھر والی تلخ کلامی کرے گی ۔ یا ۔ کڑک مرغی کے سے انداز سے جو ایک بار چلانا شروع کرے گی تو پھر سارا محلہ سنے گا اور صبح محلے کے ہر گھر کا موضوع یہی ہوگا ۔ مگر وائے قسمت ایسا نہیں ہوتا ۔ وہ نیک بخت کمال متانت ، ضبط اور تحمل سے سر نیوڑائے مسکراہٹ سے میرا استقبال کرے گی ۔

کھانا گرم کرنے کے متعلق پوچھے گی - اور - میرا ضمیر جاگ پڑتا ہے بلکہ سمجھیے کہ یہی تازیانہ ہوتا ہے اور میری ساری عیاشی کا نشہ گویا اترنے لگتا ہے۔ میں باہر گزارے ہوئے وقت کی ترنگ میں اگر آنکھیں موندے سونا چاہتا ہوں۔

وہ پالتو بلّی کی طرح میرے قدموں میں بچھی جاتی ہے - آپ نہیں جانتیں کہ وہ گھڑی مرد کے لیے کس قدر نازک اور فیصلہ کن ہوتی ہے -

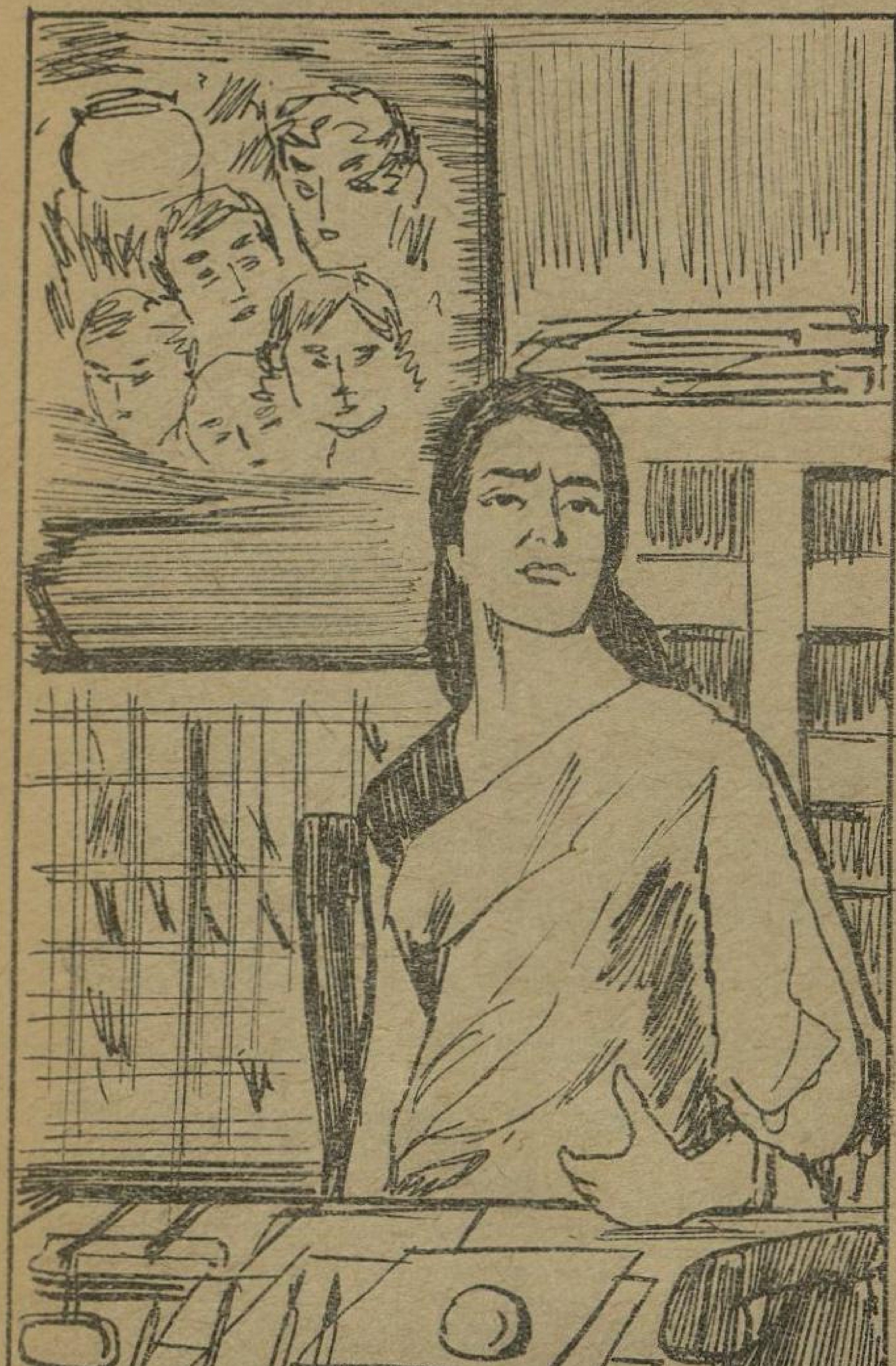
ایک طرف عیاشی کا نشہ —

دوسری طرف وفا اور خدمت —

ویسے ایک ماننے والی بات ضرور ہے کہ آخر کار وہ گھڑی آتی ہے کہ جب مرد وفا اور خدمت کے دائرہ میں چھلانگ لگا دیتا ہے بشرطیکہ مرد باضمیر ہو۔

یہ طریقہ ہماری بڑی بوڑھیاں اختیار کیا کرتی تھیں — تھا تو سو فیصد کامیاب مگر آج کی بات اور ہے - قدریں بدل گئی ہیں - اب خودسری بڑھ گئی ہے یا عورت اس قدر بے صبر ہو گئی ہے کہ وہ مستقبل کا انتظار نہیں کرتی حال کو اہمیت دیتی ہے — ویسے میری بدقسمتی کہ میرا واسطہ "قدیم عورت" سے پڑا ہے اس لیے جب میں سنتا ہوں کہ فلاں کی بیوی نے اسے سرِ عام آن کر بُرا بھلا کہا — یا فلاں دوست کی بیوی خود ہمارے حلقے میں آئی اور خاوند کی زیادتیاں اور کوتاہیاں گِنوا گِنوا کر روئی — تو کبھی کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میرا واسطہ بھی ایک خرخراتی ہوئی نیاز مند قسم کی بیوی سے نہیں بلکہ اپنا حق مانگتی ہوئی اس جدید عورت سے پڑتا مگر وائے حسرتا !"

اب ان حالات میں بے چاری جدید عورت تو اپنی جگہ پر پریشان ہے اس کا مسئلہ بے حد نازک ہے :



اس نے پرانی قدروں کو تج دیا!

گھر کی گاڑی متوازن رکھنے کے لیے مرد کے ساتھ گھریلو آمدنی کا بار بھی بانٹ لیا مگر مرد پھر بھی مطمئن نہیں ہو پاتا۔ یا۔ یوں کہہ لیجیے کہ اس مرد نے اقتصادی طور پر مطمئن ہو کر ذہنی خلجان میں اضافہ کر لیا ہے!

ایسے ہی حالات سے دو چار ہو کر ایک ملازمت پیشہ خاتون نے کہا :—

"توبہ — یہ ہم نے کیا روگ لگا لیا ہے ملازمت کا — سوچا تھا خاوند — یعنی یہ جدید خیالات کا مرد میری ہمت کی داد دے گا — مگر اسے تو ہمہ وقت یہی پریشانی رہتی ہے کہ ملازمت کے دوران اپنے ادارے میں دوسرے مردوں سے میرے تعلقات کیسے ہیں — کئی بار تو ایسے ایسے طعنے سننے پڑتے ہیں کہ خون اُبل آتا ہے۔ جی چاہتا ہے ایسے میاں پر دو حرف بھیج کر کہیں اور چلی جاؤں مگر پھر جو آنگن میں کھیلتے ہوئے بچوں پر نظر پڑتی ہے اور مردوں کی قطار پر نظر جاتی ہے کہ ایک کے بعد دوسرا — تو خیال گزرتا ہے کہ یہ سب مرد ایک جیسے ہیں — ان کے نظریے ان کے خیالات بلکہ عورت اور بیوی کے لیے ان کے بنائے ہوئے قانون — ان کے کھینچے ہوئے دائرے سب ایک جیسے ہیں بلکہ کئی جگہوں اور حالات میں یہ دائرے اور بھی سمٹ گئے ہیں۔ ہماری بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ وہ بے دست و پا تھیں اور مرد کی دست نگر — اسی لیے مرد کی جائز ناجائز سختیاں برداشت کرتی رہیں اور ہم اس عورت کو ہمیشہ اپنی تحریروں — اپنی سوچوں میں "مظلوم ہستی" کے نام سے موسوم کرتے رہے — مگر جب اپنی طرف دیکھتی ہوں تو یہی اپنے آپ کو

اس بے دست و پا ہستی سے زیادہ مظلوم پاتی ہوں کہ دست و پا رکھتے ہوئے بھی اس سے دور نہیں جا سکتی کہ میرے پاؤں میں معاشرے کی زنجیر ہے اور کانوں میں بچوں کا شور موسیقی کا رس گھولتا ہے۔ میں اپنے جدید طرز کے مکان کو دیکھتی ہوں۔ باہر معاشرے میں اپنی عزت و وقار کا تصوّر کرتی ہوں اور چپ چاپ لیٹ کر سوچتی ہوں:

"میں ماں ہوں — ان بچوں کے لیے مجھے کچھ کرنا ہی ہے۔ مجھے اپنے بچوں کو اس دور کی جدید ذہن نسل کے افراد بنانا ہے — اور میں بیوی ہوں — جو جدید دور کی ہو یا قدیم کی — اس کا ایک کردار ہوتا ہے، اور مجھے خوشی ہے کہ میں وہ کردار ادا کر رہی ہوں۔"

اور — یہ المیہ — یہ زندگی — یہ حالات صرف ایک عورت کے نہیں بیشتر کے ہیں اور اب ان کا حال یہ ہے کہ وہ پرانی قدروں سے بہت آگے نکل آئی ہیں۔ نیا دور ابھی پوری طرح تشکیل نہیں پایا۔ معاشرے کے اس تعمیر و ترقی کے دور میں وہ اپنا کردار کہیں نہ کہیں فٹ کرنے کی کوشش میں ہیں اور یہاں وہ بیوی کا خانہ ذرا سا بدلتی ہیں مگر وہ بدلا ہوا نہیں پاتیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے باوجود ان کے فرائض کے خانے قدیم ہیں اور انھیں بیک وقت دو سانچوں میں ڈھل کر رہنا ہے اور یوں وہ ایک کڑی مشقت کو برداشت کر رہی ہیں۔

شوہر کی نفسیات کو سمجھنا ہر عورت کے بس میں نہیں — ویسے یہ بھی ہے کہ اگر عورت ایک بار اپنے مرد کی عادات سمجھ لے تو پھر وہ کبھی زندگی بھر ہار نہیں کھاتی مگر عورت اپنے مرد کی عادت سمجھے بغیر جب اپنے مرد کو اپنے بس میں کرنے میں ناکام

رہتی ہے اور کسی کامیاب خاتون کو دیکھتی ہے تو فوراً الزام دیتی ہے :

"ہائے — اس کم بخت نے تو میاں پر جادو کر رکھا ہے۔"

"تعویذ گھول کر پلاتی ہے۔"

مگر بہن ! سچی بات تو یہ ہے کہ مرد کا دل جیتنے کے لیے پہلے عورت کو مرد کے ہاتھوں کھلونا بننا پڑتا ہے۔

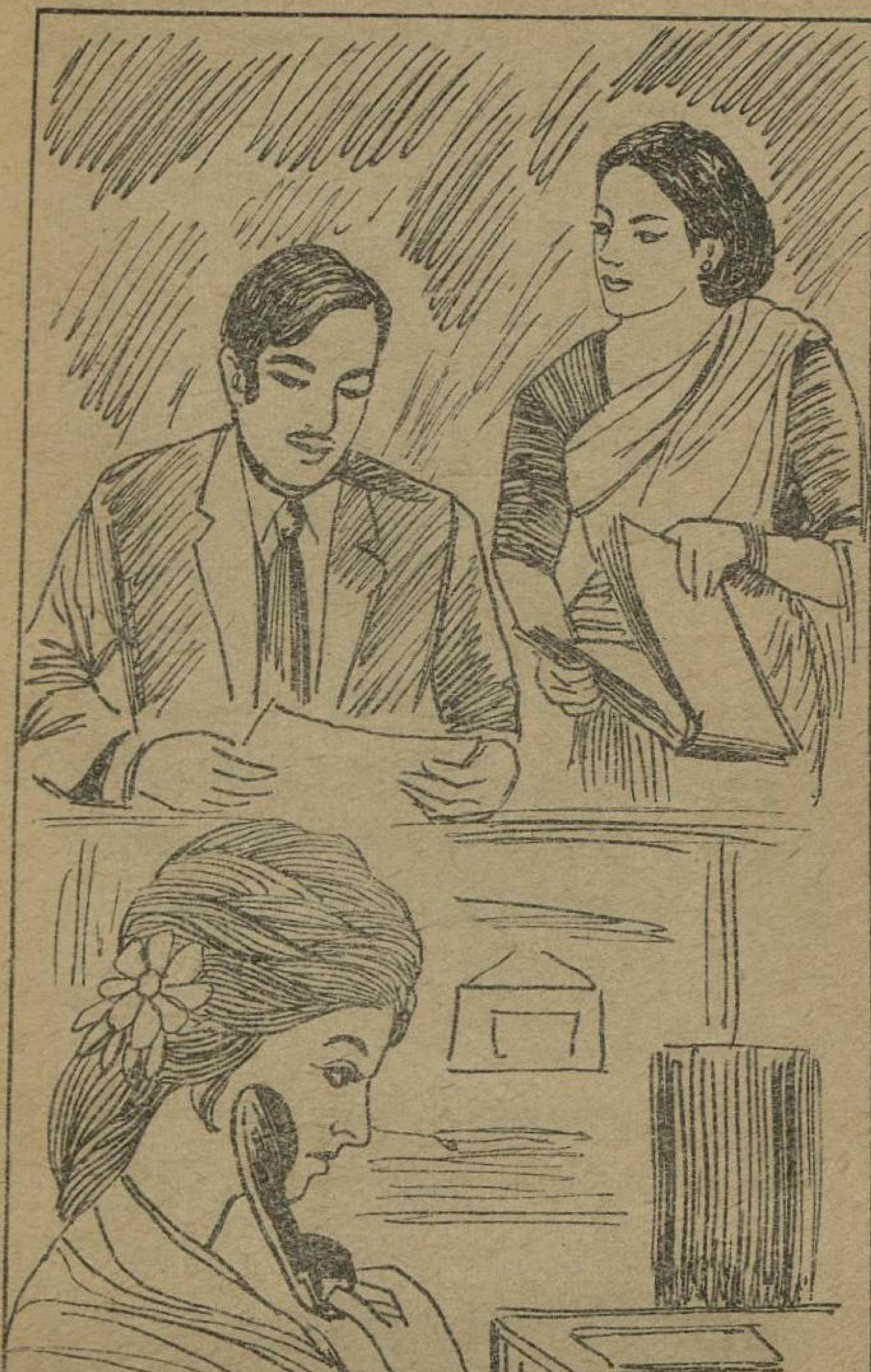
ایک صحافی کی تیسری بیوی مزے مزے سے کہے جا رہی تھیں۔

دراصل میں ان سے پوچھنا یہ چاہتی تھی کہ انھوں نے اپنے شوہر کی عادات کس طرح بہتر کی ہیں :

"رفعت بہن !"

انھوں نے یوں آغاز کیا اپنی کامیاب جدوجہد کا — :

"ان کی پہلی بیوی ذرا تیز زبان تھیں - اگر یہ کبھی غصّے میں بول لیتے تو وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی — تم جانتی ہو مرد کبھی اپنی ہتک برداشت نہیں کرتا — پھر وہ یہ چاہتی تھی کہ یہ اپنے والدین کو چھوڑ دے اور صرف اسی کا ہو کر رہ جائے مگر یہ مسئلہ اس کی بدزبانی سے اور بھی ٹیڑھا ہو کر رہ گیا - اس نے اپنی ضرورت کو تو ہمیشہ مقدّم جانا مگر خاوند کے ذہنی سکون کو قطعی نظرانداز کر گئی — دوسری بیوی بھی بہت کچھ اسی ڈگر پر چلی اور انھوں نے یکے بعد دیگرے دونوں بیویوں کو چھوڑ دیا — اب تیسری میں آئی - میں ان کی گھریلو کشمکش سن چکی تھی - میں والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں اور وہ خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں مگر یہاں میں نے اپنے آپ کو ان کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا - میں ملازم سے کام کروانے



کی عادی تھی مگر یہاں ہیڈ ٹی سے رات کے کھانے اور چائے تک اپنے ہاتھ سے بناتی ۔ میں نے سب سے پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ یہ اپنا وقت کہاں اور کیسے بسر کرتے ہیں۔ صحافی کی زندگی خصوصاً رپورٹر کی حدود و تعین نہیں کی جا سکتیں ۔ پھر بھی میں نے رفتہ رفتہ ان کی عادات کا بغور مطالعہ کیا اور سب سے پہلے تو میں نے ان کے میکے والوں سے انتہائی اچھا سلوک کرنا شروع کیا بلکہ ان کی پہلی بیویوں کے بچوں کو گھر بلا بلا کر پیار کیا ۔ گو وہ مجھے "سوتیلی ماں" سے زیادہ درجہ نہ دے سکے مگر اب اتنے برس گزر جانے پر میں محسوس کرتی ہوں کہ میں نے ان بچوں کے دل جیت لیے ہیں۔ میری دوسری سوکن زندہ ہے اور وہ کہتی ہے کہ میں نے خاوند کے ساتھ ساتھ بچوں پر بھی جادو کر دیا ہے ۔ کھانے میں تعویذ گھول کر پلا دیے ہیں حالاں کہ مجھے خود خاوند کے مطابق ڈھل جانے کے لیے اپنی ساری شخصیت گھول دینا پڑی۔ میں نے ان پر کبھی شک نہیں کیا ۔ مجھے معلوم ہے کہ فلمی رپورٹر کی حیثیت سے انھیں سٹوڈیو جانا ہوتا ہے۔ ہر قسم کی عورت سے ملتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ان کے دوستوں نے مجھے بے وقت فون کیا کہ :

"اس وقت آپ کے میاں فلاں عورت کے ساتھ بیٹھے ہیں۔"

میں ہنس کر کہتی :

"کوئی بات نہیں ۔ انٹرویو کر چکنے کے بعد فوراً گھر ہی آئیں گے۔"

پھر گھر آنے پر میں انھیں بالکل نہ جتاتی ۔ بلکہ دو دن بعد انھیں کہتی، کہ پرسوں آپ کے دوست نے یہ لطیفہ کیا۔

اسی لیے آج اتنے برسوں بعد میں بڑے اعتماد سے کہتی ہوں کہ میرا خاوند کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ میں نے ان کی

پسند کے لباس اور رنگ پہنے ہیں۔ بال بنائے ہیں۔ کھانے پکائے ہیں۔ یہ گھر تو دیکھ رہی ہو ناں۔ اس گھر سے انھیں خاص اُنس ہے۔ اس لیے میں بھی آج کے دور میں انہی دو کمروں میں گزارہ کر رہی ہوں، اور میں اس قدر خوش ہوں بلکہ تمھیں صاف صاف کہتی ہوں کہ میں اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت تصور کرتی ہوں کہ میں نے نہ صرف ایک خاوند کو ازدواجی زندگی کا حقیقی سکون اور آرام دیا بلکہ صحافیوں کے اس خیال کو جھٹلانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ :

"صحافت بیوی کی سوکن ہوتی ہے"

میں نے صحافت سے بھی گزارہ کیا ہے اور سوتیلے بچوں سے بھی' اور پہلی بیویوں سے بگڑی ہوئی عادات کو بھی اپنے حسنِ تدبّر سے ٹھیک کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں ناں :

"رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد"

تو بیوی اپنے خاوند کو پوری طرح جیتنے کے لیے انہی مراحل سے گزر کر کامیاب گرہستی کہلاتی ہے۔

"کیا خاوند کو بھی اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے شادی کے بعد کسی اور رُخ ؟"

میں نے یہ سوال ایک مشہور ایڈیٹر سے کیا۔

ان کی یہ دوسری شادی ہے۔ پہلی کے متعلق انھوں نے بتایا کہ وہ بیوی اخلاقاً اچھی نہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اسے بہتر کیا جائے مگر وہ انھیں خاطر میں نہ لاتی۔

بلکہ اس نے "شادی" تو محض ایک "نقاب" کے طور پر اوڑھی تھی۔ اس کا خیال تھا اس کے تلے ان کا گزشتہ رومان چھپے چوری پروان چڑھ سکے گا اس لیے یہ شادی دو ماہ بعد طلاق پر ختم ہو گئی۔

انھوں نے بتایا کہ :

"ڈرتے جھجکتے دوسری شادی کی، جو بڑی گھریلو اور نیک لڑکی ہے اس لیے میں اس کے مطابق یا اس کے ماحول کے مطابق تھوڑا سا ڈھلا ہوں۔

یہ قصہ پُر لطف ہے :

میں ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں بیوی مرد کے برابر حقوق نہیں رکھتی۔ خاوند بیوی کے کاموں میں قطعی ہاتھ نہیں بٹاتا۔ میں ایک دو بار جو سسرال گیا تو دیکھتا ہوں کہ میرے سُسر، سالے وغیرہ جب گھر آتے تو مٹھائی فروٹ لے کر۔ وہ آن کر بیوی کے حوالے کرتے۔ اس طرح گھر میں بڑی خوش گوار سی فضا قائم ہو جاتی۔ ہمارے گھر میں کوئی مرد کبھی باہر سے پھل وغیرہ لے کر آتا ہی نہیں بلکہ منگوانا ہو تو گھر آ کر کسی ملازم یا بچے کو بھیج کر منگوایا جاتا ہے۔ میں نے خود سوچا کہ میری بیوی اس ماحول کی عادی ہے جہاں مرد لے کر آتے ہیں۔ ظاہر ہے اسے سسرال میں یہ اپنا ماحول نہیں لگے گا۔ تو کہیں وہ یہ رائے قائم نہ کر لے کہ سسرال والے "کنجوس عادت" کے ہیں — یوں بھی بیوی کو خوش کرنے کے لیے اپنے گھر میں یہ خوش گوار تبدیلی لانا اچھا قدم ہوگا۔

اب میں نے یہ کیا کہ جب دفتر سے گھر جاتا تو موسم کا پھل لے جاتا — جا کر بڑی بھابی یا اماں کے ہاتھ میں دے دیتا۔ گھر بھر کو میرا یہ رویہ بڑا عجیب لگا۔ مگر میں برداشت کیے گیا۔

اب یہ حالت ہے کہ باہر سے ابّا آئیں تو کچھ لے کر ۔ اور بھائی بھی لے کر آنے لگے ہیں ۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ گھریلو فضا میں ایک سکون ایک خوشگواری سی بکھر جاتی ہے ۔

اس کے برعکس اگر مجھے بیوی اپنے باپ بھائیوں کی مثالیں دے دے کر اس بات پر مجبور کرتی کہ میں ان ایسا رویّہ اختیار کروں تو میں کبھی بیوی کی یہ بات نہ مانتا ۔ کیوں کہ مرد بیوی کے مطابق ڈھلنے میں بھی اپنی مردانہ وجاہت اور انفرادیت قائم رکھنا چاہتا ہے ۔ مجھے یہ خوشی ہے کہ میری بیوی نے کبھی اپنے میکے والوں کی مثالیں دے دے کر گھریلو فضا کو بوجھل نہیں ہونے دیا ۔ اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ اچھی بیوی کے فرائض میں اس حقیقت کو بڑا دخل ہے کہ وہ اپنے ازدواجی فرائض میں اس بات کو یاد رکھے کہ وہ اپنے شوہر کو بات بات پر میکے کی مثال نہ دے ۔ حالاں کہ اس حقیقت سے کون شادی شدہ مرد انکار کر سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب خاوند بہت کچھ اپنی بیوی کی عادات، خیالات اور ماحول کے مطابق ڈھل جاتا ہے ۔ ویسے یہ ضرور ہے کہ بیوی کو بار نہیں ہونا چاہیے اور شوہر کے متعلق اس ضرب المثل کو یاد رکھنا چاہیے کہ :

"سہج پکے سو میٹھا ہو" ۔

آپ جانتی ہیں موم گرم ہو تو پگھلتا ہے ورنہ پتھر کی طرح سخت ہوتا ہے اور ٹھنڈے لوہے پر ہتھوڑا مار کر ہاتھ میں چوٹ تو آ سکتی ہے لوہے کو کاٹا نہیں جا سکتا ۔ شوہروں کو جیتنے کے لیے بھی بیویوں کو صبر و استقلال سے محنت و خدمت کرنا چاہیے کہ اس سے نتائج یقیناً بہتر ترین ہوتے ہیں ۔

اکثر خواتین کو یہ شکایت رہتی ہے کہ مرد انھیں پوری طرح اپنا ساتھی نہیں بناتا۔ اس سلسلہ میں اکثر خواتین کا کہنا ہے کہ مردوں کی یہ عادت ہے کہ انھیں اپنا دستِ نگر رکھتے ہیں اور انھیں مکمل طور پر رفاقت کا احساس نہیں دلاتے۔

"یعنی — ؟"

میں نے ایک محترمہ سے ان کی بات کی تفصیل چاہی :

"یعنی — یہ کہ — وہ اپنا بنک اپنے پاس رکھتے ہیں مجھے اس میں شریک نہیں کرتے — حالاں کہ گھر کے اخراجات کی طرح ہمارا بنک بھی مشترکہ ہونا چاہیے مگر انھوں نے آج تک مجھے اپنے بنک میں شامل نہیں کیا۔

اب دیکھو انھیں دورے پر جانا پڑتا ہے پیچھے مجھے ایمرجنسی پڑ جائے تو میں تیرے میرے سے پیسے مانگتی پھرتی ہوں حالاں کہ گھر کے خرچ تو نہیں رکتے — پیسہ یہ یوں بھی خرچ کرتے ہیں مگر مجھے اعتماد میں لے کر پیسے کے معاملے میں مجھے اپنا حصے دار کیوں نہیں سمجھتے۔ خرچ یوں بھی مجھے ہی کرنا ہے حالاں کہ وہ خود بھی کنجوس نہیں ہیں۔ اس لیے میں اکثر یہ کہتی ہوں کہ ہمیں ہر حالات کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے اس لیے خاوند کو چاہیے کہ وہ بیوی کو عضوِ معطل نہ بنا کر رکھے بلکہ اسے اپنا ایسا دستِ تعاون بنا کر رکھنا چاہیے جو بھرپور تعاون کرنے کے علاوہ — اپنی جگہ ایک مکمل ہستی ہو۔"

جنگی قیدیوں کی بیویوں کا ایک اجتماع تھا - ایک سربراہ قسم کی خاتون ، بیویوں سے پوچھ رہی تھیں :

" آپ کے مطالبات کیا ہیں ؟ ہم حکومت تک پہنچائیں ۔"

" ہمارے قیدی واپس لاؤ !"

کا شور جب تھما -

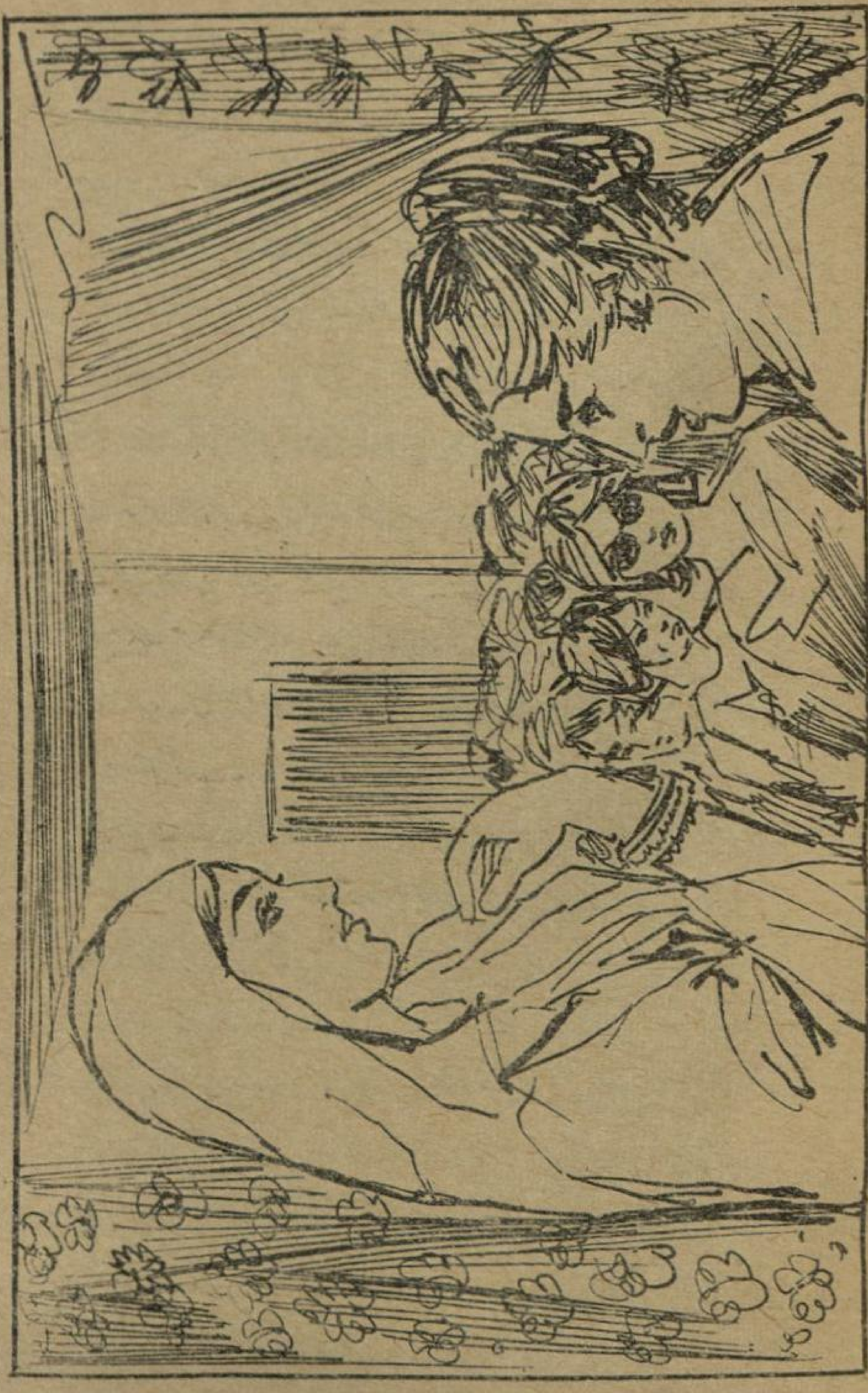
تو تنہا ایک خاتون نے آواز بلند کی :

" انھیں ابھی کچھ عرصہ اور وہاں ٹنگے رہنے دو ۔"

اس سے پیشتر کہ باقی خواتین اس سیدھی سادی دیہاتی عورت کی تکا بوٹی کر دیتیں - اس نے سر پر ریشمی دوپٹے کا آنچل پھیلاتے ہوئے کہا :

" پچیس برس کی رفاقت میں اس نے کبھی مجھے تنخواہ کا حساب نہیں دیا — اب ان حالات میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے خاوند کی تنخواہ ڈھائی ہزار روپے ماہانہ ہے اور وہ مجھے صرف سات سو روپے دیا کرتا تھا - میں اس میں گھر کا خرچ چلاتی ، رشتے داروں میں ملتی ، بیاہ شادیوں پر خرچ کرتی ، اب سال بھر سے زائد ہو گیا ہے مجھے ڈھائی ہزار روپے مہینہ مل رہے ہیں — میں نے اپنی پسند کے مطابق خرچ کیا ہے - اپنی بچیوں کا جہیز بنایا ہے — گھر کا فرنیچر خریدا ہے - میں چاہتی ہوں ابھی میری باقی ماندہ چیزیں بن جائیں تو وہ واپس آئے — کیوں کہ وہ آتے ہی تنخواہ سمیٹ لے گا اور مجھے پانچ سات سو روپے سے زائد خرچ نہ دے گا — مجھے دوسرا دکھ یہ بھی ہے کہ وہ ابھی تک اتنی تنخواہ کہاں خرچ کرتا رہا ہے — کیا میرا خاوند عیاش ہے ؟ تو اس نے پھر مجھ پر اور ان چھ بچوں پر یہ ظلم کیوں کیا ہے ؟"

اس سیدھی سادی دیہاتی عورت کی اس تفصیلی گفتگو کے بعد اکثر خواتین نے



اپنے آپ کو ٹٹولا تو انھیں وہ خاتون بالکل سچی نظر آئیں کہ ان کے خاوندوں نے بھی انھیں اکیلے زندگی گزارنے کا ڈھنگ کب سکھایا تھا۔

ایک اور دل جلی خاتون بولیں :

"میں کہتی رہتی تھی مجھے کار چلانا سکھا دیں مگر وہ ہمیشہ میری اس فرمائش پر ہنس دیتے — اب بتاؤ یہ ڈیڑھ برس سے جو کار گیراج میں بند پڑی ہے اس کا کیا فائدہ — بچے تانگے پر سکول جاتے ہیں اور میں سڑکوں کے کنارے رکشے ٹیکسی کے انتظار میں دھکے کھاتی رہتی ہوں۔ آخر یہ مرد ہم میں ہماری اس اہلیت کو کیوں نہیں ابھارتے کہ ان کے بعد بھی، ان کے بغیر بھی ہم زندگی سکون، سلیقے اور وقار سے گزار سکتی ہیں"

اس سلسلہ میں جب مردوں سے بات کی کہ :

"دوسروں کی مصیبت آپ کے لیے تجربہ ہوتی ہے — آپ نے کیا سوچا؟"

تو ایک صاحب بولے :

"ظاہر ہے ہمیں نئے حالات کا ساتھ دینا چاہیے اور بیویوں کو اس حد تک خود اعتمادی ضرور عطا کر دینا چاہیے کہ وہ ہمارے بعد بھی باوقار طریقے سے زندہ رہ سکیں"

ان صاحب نے بتایا کہ :

"میں سوچ رہا ہوں کہ بنک کا اکاؤنٹ مشترکہ کر لوں۔ انھیں انشورنس وغیرہ کے کاغذات سمجھا دوں کہ یہ سب ضروری چیزیں ہیں — میں سوچتا ہوں کہ ابھی تک مجھے خیال کیوں نہ آیا تھا کہ ایسا کر دوں — کہ ہمارے تیز رفتار معاشرے کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی بیویوں کو ہر ایمرجنسی کے لیے تیار رکھیں — اور — بیویوں کو بھی بدحواسی چھوڑ کر نئے حالات کا ساتھ دینے

کے لیے اپنے آپ کو اپنی نئی ذمہ داریوں کا اہل ثابت کرنا چاہیے۔"

ایک بزنس مین کی بیگم سے بات ہوئی تو وہ بولیں :

"آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے آج تک نہیں معلوم کہ میرے میاں کیا کرتے ہیں۔"

"آپ نے پوچھا کیوں نہیں ؟"

"وہ کہتے ہیں تمھیں کھانا کپڑا تو مل رہا ہے اور باعزّت زندگی۔ پھر تمھیں کرید سے فائدہ ؟"

"کیا وہ بلیک میلنگ کرتے ہیں یا سمگلنگ ؟"

"نہیں۔ ہیں تو شریف آدمی۔ مگر اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جہاں عورت کو صرف "بیوی" سمجھا جاتا ہے شریکِ حیات نہیں !"

انھوں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا :

"اب دیکھو نا، شادی کو نواں سال ہے مگر میں کبھی اکیلی گھر سے باہر نہیں گئی۔ رکشے پر اکیلے جانے سے یہ منع کرتے ہیں۔ بچہ بیمار ہو جائے تو گھر میں بیٹھی رہتی ہوں۔ یہ آئیں تو لے کر جائیں۔ آخر میں پڑھی لکھی ہوں، بے وقوف نہیں ہوں مگر انھیں تو اعتماد ہی نہیں آتا۔ اور تو اور۔ اب مجھے میکے بھی جانا ہو تو خود ساتھ لے کر جاتے ہیں اکیلے وہاں بھی نہیں جانے دیتے۔"

"آپ سے بہت پیار ہوگا۔ آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے ہوں گے۔"

میں نے مذاق کیا۔

"پیار علیحدہ چیز ہے۔ مگر گھر میں میں ہوتی ہوں تو کونسا میرے ہی پاس

بیٹھے رہتے ہیں — باہر سے آئیں گے تو اپنے اباجی سے باتیں — رات کو وہاں سے اپنے کمرے میں آئیں گے جب میں بچوں کو سلا کر سو رہی ہوتی ہوں — انھوں نے مجھے آج تک نہیں بتایا کہ ان دنوں انھوں نے کتنا مال خریدا — کتنا نفع یا نقصان ہوا — اگر میں کبھی سنتی ہوں تو ان کے اباجی کی زبانی — وہ خوش ہوں تو پتہ لگتا ہے کہ انھیں کچھ نفع ہو گیا۔ بس مجھے یہ غصہ آتا ہے کہ یہ مجھے قابلِ اعتماد ساتھی کیوں نہیں سمجھتے۔ مجھ سے کبھی نفع نقصان کی بات کیوں نہیں کرتے ؟"

"آپ نے خود کبھی دلچسپی لی ہے ان کے معاملات میں ؟ — آپ نے خود کبھی پوچھا ہے کہ ان دنوں کیا کر رہے ہو ؟"

"میں کیوں پوچھوں انھیں چاہیے وہ ذکر کریں۔"

"ہو سکتا ہے وہ سوچتے ہوں کہ آپ کو ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں۔"

"مجھے شرم آتی ہے پوچھتے — سوچتی ہوں کہ وہ کیا کہیں گے کہ اسے محض روپے پیسے سے دلچسپی ہے اس لیے میں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔"

"آپ ہر روز اخبار پڑھتی ہیں ؟"

"نہیں — وقت ہی نہیں ملتا تفصیل سے پڑھنے کا — بس نظر پڑ گئی تو سرخیاں دیکھ لیں — اب اخبار میں سیاسی باتیں ہوتی ہیں ان سے ہمارا کام ؟"

"سیاست کے عروج و زوال پر نہ سہی — آپ یوں کیا کریں اخبار پڑھ کر مختلف اشیاء کے بھاؤ اور چیزوں کی کمیابی اور نایابی پر ان سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ پھر وہ ضرور آپ سے اپنے بزنس کی باتیں کیا کریں گے۔"

"اب میں اتنا لمبا بکھیڑا کیا کروں !"

"مرد کا ساتھی بننے کی خواہش ہے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا — جب تک آپ

ان کی دل چسپی میں دل چسپی نہ لیں گی ان کے ذہنی طور پر قریب کیسے ہوں گی اور ذہنی مطابقت آپ کو ان کا با اعتبار ساتھی بنا دے گی۔"

⁂

"ہم نے گھر کی ذمہ داریاں تو پوری پوری اٹھالیں ۔ اب چاہیے کہ باہر کی ذمہ داریاں بھی اٹھالیں ۔"؟

ایک پائیلٹ کی بیگم نے خواتین کو مشورہ دیا ۔

"وہ کیسے ؟" میں نے پوچھا

وہ بولیں :

"بات در اصل یہ ہے کہ میرے میاں پائیلٹ ہیں ۔ وہ ہر روز نہ صرف خود سفر کرتے ہیں بلکہ بیسیوں گھرانوں کو سفر پر لے کر نکلتے ہیں ۔ اگر وہ پُرسکون ذہن سے کام کریں گے تو سب کو منزلِ مقصود پر پہنچا سکیں گے ۔ جب سے میں نے یہ سوچا ہے میں نے گھر کے علاوہ باہر کی ذمہ داریاں بھی اٹھالی ہیں ۔ پہلے وہ سب سامان مارکیٹ سے لاتے تھے ۔ اب میں کار خود چلاتی ہوں ۔ کار کا بھی لطیفہ ہے ۔ وہ جب باہر جاتے ہماری کار بند ہو جاتی اور بچے بسوں پر سکول جاتے ۔ میرے لیے یہ سب کچھ تکلیف دِہ تھا ۔ مجھے کہیں آنا جانا ہوتا تو دوسروں کی محتاجی ۔ میرے میاں نے مجھے کہا :

"دیکھو ! تمھیں گاڑی اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہیے ۔"

لہٰذا میں نے چند ماہ میں کار چلانا سیکھ لی ۔ اب وہ باہر ہوں تو انھیں گھر کا وہ فکر نہیں ستاتا کہ بچے کیا کر رہے ہوں گے ۔ انھیں احساس ہے کہ میں بڑے اعتماد سے گھر اور باہر کے کام کر لیتی ہوں اور میں تو کہتی ہوں

آج کے دور میں بیویوں کو یہ لازم ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کے ذہنوں پر اپنا بوجھ نہ ڈالیں بلکہ انھیں دیگر معاملات و حالات کے لیے ہلکا پھلکا رکھنے کے لیے ان کی ذمہ داریاں بانٹ لیں تاکہ باہر کی دنیا میں مرد اپنی ذمہ داریاں سکون و اطمینان سے پوری کر سکیں۔ ویسے اس سلسلہ میں مردوں کو قدم اٹھانا چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کو اس طرح باہر کے کاموں سے متعارف کروائیں کہ بیویاں اسے بوجھ کی بجائے ایک ذمہ داری سمجھ کر اپنائیں اور اسے بخوشی پورا کریں تاکہ وہ صحیح معنوں میں مرد کی نصف بہتر کہلا سکے۔"

ایک اور جنگی قیدی کی بیوی سے میں نے پوچھا:

"میاں کی جدائی نے آپ پر کیا اثر کیا ہے؟"

وہ بولیں:

"میں زیادہ با اعتماد سمجھنے لگی ہوں اپنے آپ کو — یعنی اب میں پورے اعتماد سے ہر کام کر گزرتی ہوں۔ دراصل میری حالت کچھ اس طرح رہی ہے کہ میکے میں تھی تو ہماری امی کپڑے تراش کر دیا کرتیں ہم بہنیں سیا کرتیں۔ میں نے کبھی نہیں تراشے — اپنے گھر آئی تو دو بار امی سے جا کر ترشوائے۔ تو امی نے طعنہ دیا کہ کب تک میری دست نگر رہو گی —

چنانچہ میں نے درزی سے کپڑے سلوائے تو خاصے مہنگے پڑے۔ آخر ایک دن میں نے قینچی پکڑ لی اور خود ہی کپڑے تراش لیے اور اب میں بڑے اعتماد سے نہ صرف اپنے کپڑے تراش کر سی لیتی ہوں بلکہ دوسروں کے بھی تراش دیتی ہوں۔

جب میرے میاں وہاں قید ہوئے ہیں تو میں بوکھلائی پھری۔ مجھے

نہ توکبھی انشورنس کی قسط سے واسطہ پڑا تھا — نہ بنک سے — مجھے نہ زمین کا پتہ تھا — نہ مکان کا — چنانچہ مجھے عزیزوں نے مشورہ دیا کہ میں بچوں کے مستقبل کے لیے ایک ایسی خاتون بن جاؤں جو بچوں کا باپ بھی ہو — اور — میں بن گئی۔

یقین کریں — پہلے دن بنک گئی تو اپنے بھائی کو ساتھ لے کر۔ زمین کے کاغذات اپنے بہنوئی کے حوالے کیے مگر رفتہ رفتہ میں نے سارے کام خود کیے۔ ان کے آنے تک مکان بھی بنوا لیا —

کار چلانا سیکھی۔

میں تو کہتی ہوں جب سر پر پڑتی ہے تو انسان پتھر بن کر ہر چیز کا مقابلہ کر گزرتا ہے — مگر ہمیں ہمیشہ ایسے حالات و تربیت میں رہنا چاہیے کہ ہم کچھ سہہ — کچھ کر گزریں۔

مجھے بے دست و پا رکھنے میں میری والدہ کی طرح میرے میاں کا بھی قصور تھا۔ انھوں نے کبھی مجھے ان چیزوں سے آگاہ ہی نہ کیا تھا ورنہ دیکھ رہی ہیں کہ اہلیت تو میرے اندر موجود تھی — بس "کُن" کی کسر تھی — اور وہ پوری ہو گئی — اب وہ آئے ہیں تو مجھے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ میری عملی زندگی کا ان پر نفسیاتی اثر ہوا ہے اور وہ خود اپنے آپ کو بہت مضبوط اور توانا محسوس کرنے لگے ہیں۔

کہہ رہے تھے کہ:

"میں اکثر سوچا کرتا تھا میرا گھرانہ اپنے ملک سے چند برس پیچھے رہ جائے گا۔ میری قید کے باعث — ! مگر اب آکر محسوس ہوا کہ ہم ایک قدم بھی پیچھے نہیں رہے اور یہاں کوئی بھی خلا باقی نہیں —

تم نے میرے بعد خاصی سمجھ داری کا ثبوت دے کر ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے بچا لیا ہے۔"

اور واقعی سمجھ دار بیوی وہی ہو سکتی ہے جو حالات کے تقاضوں کو سمجھے اور انھیں پورا کرنے کے لیے بھرپور کردار ادا کرے۔

اکثر خواتین کو عادت ہوتی ہے کہ اپنے سسرال والوں اور خاوند کی برائیاں کرتے رہنا تاکہ دنیا انھیں مظلوم سمجھے اور ان سے ہمدردی کرے۔ یہ اسی قسم کی خواتین ہوتی ہیں جو چاہتی ہیں کہ دنیا کی توجہ کا مرکز بنی رہیں اور ہمدردیاں سمیٹتی رہیں۔

ظاہر ہے ان کی زندگیاں سخت ناکام رہتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ ان میں اپنی انا یا "عزتِ نفس" کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ وہ جب بھی اپنی بات شروع کرتی ہیں کچھ اس طرح کہتی ہیں :

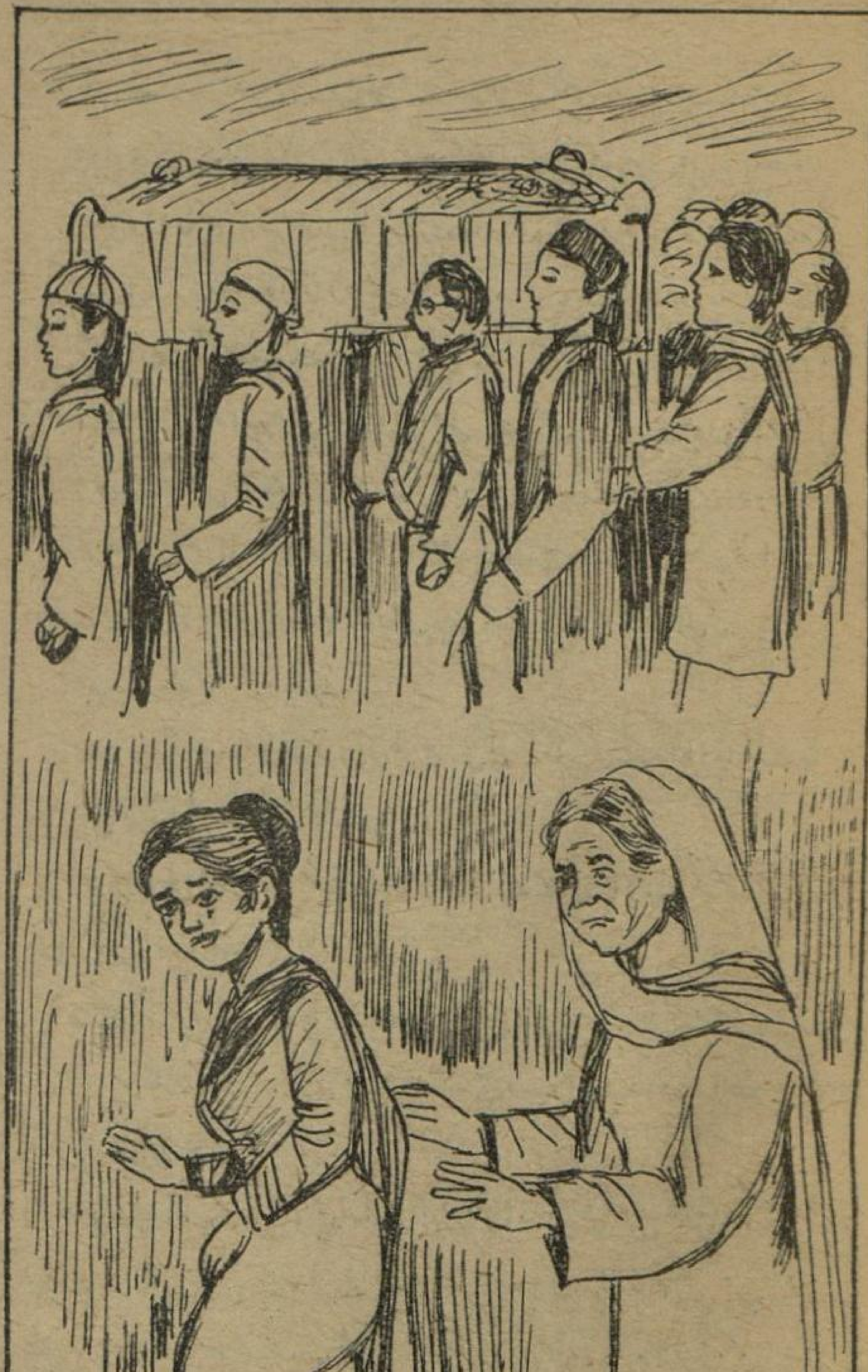
"اے — ہے میں تو ان کی عزت کے مارے چپ ہوں — ورنہ —"

اس وقت احساس ہوتا ہے کہ خود انھیں "اپنی عزت" کا خیال کیوں نہیں۔ وہ زندگی دوسروں پر احسان کرکے گزارنا چاہتی ہیں۔

ایک ناول نگار خاتون میری دوست ہیں۔ بڑی ہنس مکھ، شریر، بات بات پر قہقہہ لگانے والی — مجھے معلوم تھا کہ ان کا میاں انھیں چھوڑ کر پرائے دیس میں سفید چمڑی والی عورت کو ان پر ترجیح دے چکا ہے مگر دوستی کے باوجود کبھی انھوں نے حرفِ شکایت زبان سے نہ نکالا بلکہ جب بھی ذکر آیا اپنے سسر کا بے حد احترام کیا اور اپنے سسرال والوں کی خوب خوب تعریفیں کرتیں۔

ایک دن میں نے پوچھا :

"تمھیں ان لوگوں نے اتنے دکھ دیے اور پھر بھی تم ان کے قصیدے گاتی ہو — آخر کیوں — ؟"



"اس لیے کہ یہاں قصور وار ہے اس کے سب عزیز نہیں۔ میں ایک کے جرم کی سزا دوسروں کو کیوں دوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں سب میں یہ اعلان نہیں کرنا چاہتی کہ میرا میاں جا چکا ہے اور اس نے دوسری عورت سے شادی کر کے میرے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ اس سے میرے وقار کو نقصان پہنچتا ہے۔ لوگ سب سے پہلے یہ سوچیں گے۔ اس میں کوئی برائی ہو گی جو میاں اسے چھوڑ گیا۔ اب جو میں سسرال والوں سے اچھی طرح رہی ہوں تو لوگ اس کے برعکس سوچتے ہیں۔ سب کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں اور تو اور خود میرے سسرال والے میرا بے حد احترام کرتے ہیں اور میرے سسر تو اتنے اچھے ہیں کہ انھوں نے جائداد میں سے اپنے بیٹے کا نام نکال کر میرا اور میرے بچے کا رکھ دیا ہے۔

اب اگر میں جاہل عورتوں کی طرح ان کی برائیاں کرتے رہنا اپنا شعار بنا لیتی تو بتاؤ میرا ٹھکانا کہاں ہوتا ؟"

سوچ کا یہ انداز کتنا مثبت کتنا فاتحانہ ہے کاش ہماری دیگر خواتین بھی اسی اندازِ فکر کو اپنائیں۔

ویسے شوہروں پر بے جا بر وے ڈالنا بھی بہتر نہیں۔ اس سے شوہر اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ بیوی ہم سے بہت ہی دب چکی ہے اور ہر بات ہر حال قبول کر لے گی۔

اسی طرح ایک خاتون اپنے خاوند کی ذرا زیادہ ہی سگی تھیں۔ مشترکہ جائداد مشترکہ گھرانے میں رہتی تھیں۔ خاوند نے ہمیشہ یقین دلایا کہ اپنے پاس کسی چیز کی کمی ہی نہیں۔ ہر کام ہر معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے مگر جونہی میاں ایک حادثے میں ابدی مفارقت دے گئے رشتہ داروں نے بیوی کو پائی پائی کو محتاج کر دیا۔ مشترکہ گھرانہ

مشترکہ جائداد پر وہی قابض رہے جو زندہ تھے اور یہ بے چاری اپنے بچوں کو لیے سمٹ سمٹا کر اپنے دو کمروں تک محدود ہو گئی اور پھر اپنے مستقبل کے لیے ایک صنعتی ادارہ قائم کر کے زندگی کے دن پورے کرنے لگیں۔

"تم نے اپنا حصہ کیوں نہ مانگا — ؟ قانونی طور پر تمھارا حق ہے۔"

"مگر میرے جیٹھ نے اپنے بچے کو اس کا متبنیٰ بنا کر ظاہر کر دیا ہے۔"

"کیا تمھارے سامنے کبھی انھوں نے نام لیا تھا ؟"

"ہاں جب اپنی اولاد نہ تھی تو وہ کہا کرتے تھے بھیا کے بیٹے کو بیٹا بنا لوں گا۔ مگر کاغذی کارروائی نہ تھی ویسے ایک بار یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ میں تحریر بھی دینے کو تیار ہوں۔"

"جب اپنے بچے ہو گئے تو پھر آپ نے وہ کاغذ لے کر پھاڑا کیوں نہ ؟"

"مجھے کیا خبر تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔ مجھے ان پر بھروسہ تھا کہ وہ میرے اور اپنے بچوں کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ یہ تو نہیں پتہ تھا کہ وہ یہ محنت اپنے بھائی کی اولاد کے لیے کر رہے ہیں۔ انھوں نے تو بنک میں جو پیسہ رکھا تھا شکر ہے میرا نام تھا ساتھ — تو کچھ روپیہ مل گیا ورنہ میں تو یہ سکول بھی نہ کھول پاتی۔"

شادی کے بعد عزیزوں کو ایک عجیب لالچ آن گھیرتی ہے کہ جو شخص پہلے انھیں کھلاتا پلاتا رہا ہے۔ اب بھی اسی طرح دیتا دلاتا رہے۔ جب اسے خود اپنے گھر کے اخراجات پورے کرنے پڑتے ہیں اور وہ پہلے کی طرح ان کی فرمائشیں پوری نہیں کر پاتا تو نام لگتا ہے کہ بیوی سکھا رہی ہے اور پھر سسرال والے حالات کا جائزہ لیے بغیر بیوی کو کوسنے لگتے ہیں۔

اس میں ضروری بات یہ ہے کہ بیوی کو خاوند پر پردہ ڈالنے کی بجائے بہت جلد اپنی پوزیشن واضح کر دینا چاہیے تاکہ موردِ الزام وہ نہ قرار پائے اور خاوند کو بھی

کھو کھلے وقار سے ہٹ کر حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے۔ بیوی کے گرد غلط فہمیوں کے حصار نہ بننے دینے چاہئیں۔

غلط فہمی ہی کے سلسلہ میں مجھے ایک خاتون یاد آئیں۔ بڑی سگھڑ بڑی گھریلو، مگر بدنصیبی یہ کہ بیاہی گئیں تو خیر سے گھر میں پہلی بیوی کے بچے بھی موجود تھے یقیں وہ نیک سرشت۔ انھوں نے تو بچوں کو اپنا پیار دینے کی کوشش کی۔ مگر بچے خودسر کہ انھیں ماں کہنے پر تیار نہیں۔

وہ انھیں کھلاتی پلاتی، کپڑے دھوتی، سیتی، بلکہ اپنے جہیز کے کپڑے نکال نکال کر بیٹیوں کو دے دیئے اور وہ اسے ماں کہنے پر تیار نہیں۔ ماں کو آنٹی کہا کرتیں اور وہ جل بھن کر رہ جاتی۔ اس سلسلہ میں خاوند سے بات کرتی تو وہ فرماتے ذرا ٹٹولو تو تمھیں کہاں کمی محسوس ہو رہی ہے۔ دیکھو کمی تم میں ہی ہو گی۔

اور وہ بے چاری رو دھو کر چپ ہو رہتی۔

اس نے رفتہ رفتہ جائزہ لینا شروع کیا تو معلوم ہوا۔ بچیوں کی دادی اماں اور پھوپھیاں یہ نہیں چاہتیں کہ سوتیلی ماں اور بچوں میں پیار ہو جائے۔ اس طرح انھیں گھر پر جو حکمرانی حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ اب تو وہ اپنے بیٹے سے بھی اپنی ہر بات منوالیتی ہیں بچیوں کی فرمائش کا کہہ کر۔

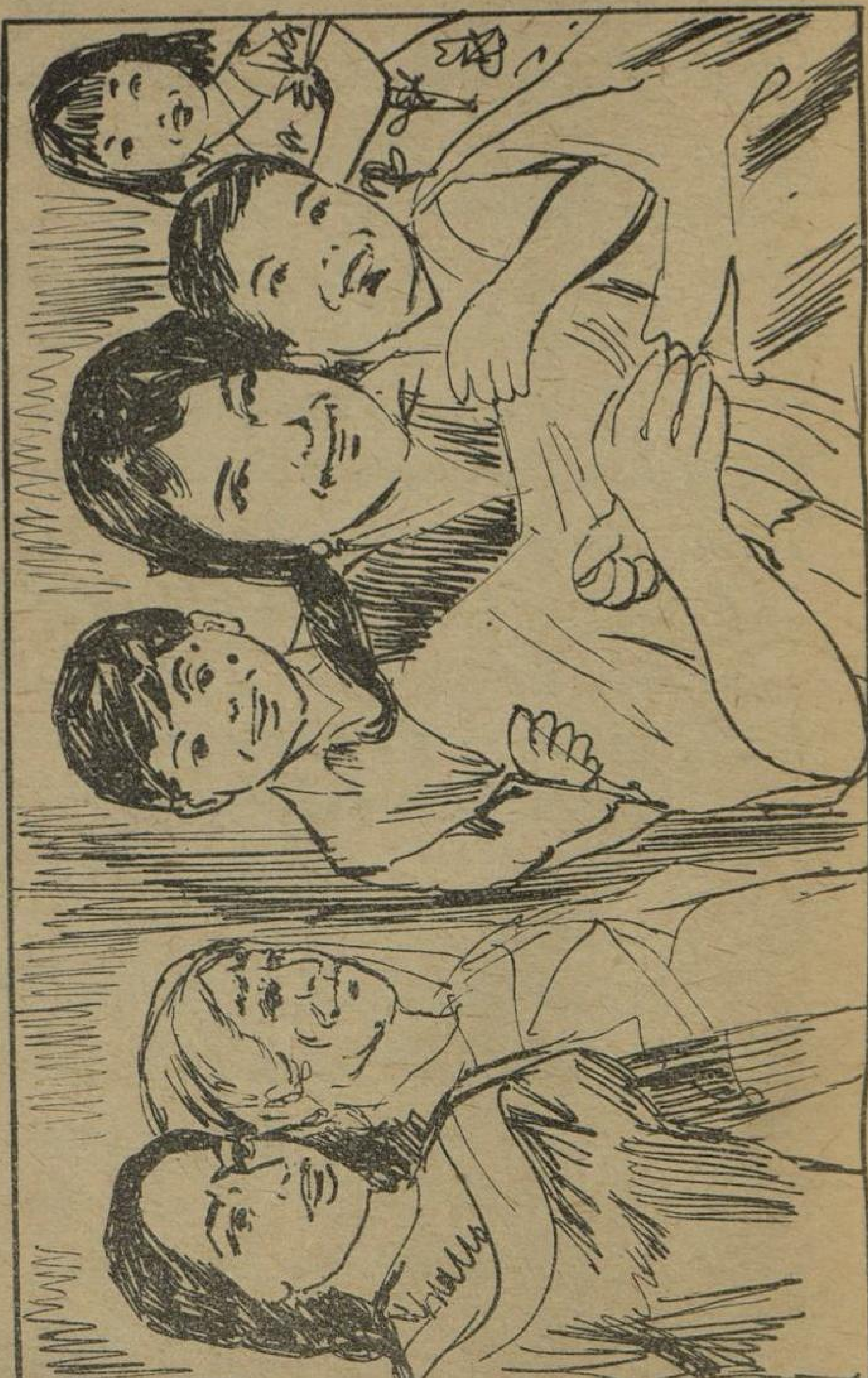
ماں بڑے خلوص سے بیٹی سے پیار کرے تو پھوپھی کہتی :

"ہاں اب اسی طرح کٹنی بن کر بچیوں کو بگاڑے گی۔"

اس روز اماں جی بیٹے کو آتے ہی کہتیں :

"دیکھو کوئی بچی بگڑ جائے۔ تمھارا تو کچھ نہیں جائے گا۔ خاندان تو ہمارا بدنام ہو گا۔"

بچیاں جوں جوں بڑی ہوتی گئیں انھیں احساس ہوتا گیا کہ ماں واقعی ماں کا



کردار ادا کر رہی ہے مگر دادی اماں کو یہ حقیقت پسندی ایک آنکھ نہ بھاتی۔

"کیا تم واقعی خلوص سے پیار کرتی تھیں اپنے سوتیلے بچوں کو؟" میں نے پوچھا

"ہاں — اس لیے کہ مجھے احساس تھا یہ معصوم مظلوم بھی ہیں پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ ان بچوں کے دل جیت کر ہی شوہر کے دل میں بس کر رہ جاؤں گی۔ اس لیے میں نے اپنے گھر کے سکون کے لیے کیا جو کچھ بھی کیا۔"

"آپ کے شوہر نے آپ کا ساتھ کہاں تک دیا؟"

"ان کا حصہ کمزور رہا — دراصل وہ میرے سامنے تو اعتراف کرتے کہ میں بچوں کو پوری طرح چاہ رہی ہوں مگر جب ماں بہن کان بھرتیں تو ڈانوا ڈول کر رہ جاتے۔ اسی کشمکش میں یہ ہوا کہ ان کے بچوں کی عادات بگڑ گئیں۔ انھیں بے جا ضد اور وقت بے وقت فرمائشیں کرتے رہنے کی عادت پڑ گئی۔ اس کے برعکس میرے بچے نارمل رہے۔ اب جو بچوں کی عادات کا فرق سامنے آیا تو باپ کو مصیبت پڑی مگر پھر بھی قصور میرا کہ تم نے انھیں ٹھیک نہیں تربیت دی۔

اب میں بولی اور بتایا کہ:

"میری تربیت وہی ہے صرف میرے بچے میرے بارے میں اپنی رائے رکھتے ہیں اور وہ لوگ اپنی دادی ماں اور پھوپھی کا کہنا مانتے تھے۔"

"سوتیلی ماں کے ناطے سے آپ نے اپنا کردار کس حد تک نبھایا؟" میں نے ایک اور سوتیلی ماں سے پوچھا۔

وہ بولیں:

"ہماری بدقسمتی کہ ہمارے ساتھ سوتیلی کا خطاب لگ چکا ہے ورنہ یقین کر و اپنے بچوں سے زیادہ ان کا خیال رکھتی ہوں کیونکہ یہ بچے ہماری اس عزت کی کسوٹی ہوتی ہے جو سسرال نے ہمیں دینی ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ اس کسوٹی میں

کہیں کہیں کھوٹ کی ملاوٹ ہو جاتی ہے اور پالنہ سوتیلی ماں کے حق میں خراب ہوتا ہے۔"

" آخر کیوں ؟"

" اس لیے کہ یہاں مرد کمزور ہوتا ہے۔"

" کیسے ؟"

" اس طرح کہ ایک دن میں ایک بچے کو نہلا رہی تھی، وہ غسل خانے میں پھسلا، گرا اور رونے لگا۔ میرے میاں جو اپنے کمرے میں بہت معروف تھے، بھاگتے چلے آئے کہ شاید میں نے اسے مارا ہے۔ اب جو آئے تو دیکھا کہ میں اس کا گھٹنا سہلا رہی ہوں اور کہہ رہی ہوں کہ :

" دیکھو اماں پاس نہ ہو تو غسل خانے میں اس طرح دوڑتے نہیں — مجھے پانی گرم تو لانے دیا ہوتا —"

میرے شوہر میری باتیں سن کر واپس پلٹنے کو تھے کہ میں نے آواز دے کر کہا۔

" منا گر گیا ہے اسے پیار نہیں کریں گے — کیسے باپ ہیں آپ ؟"

تو میرے شوہر کے چہرے پر ایک ایسا احساس چھا گیا جس میں ندامت زیادہ تھی۔"

تو یہ بات ہے کہ بیوی تو اپنا فرض پورا کرتی ہی ہے خواہ زبردستی — مگر اس سلسلہ میں شوہر کو بھی چاہیے کہ بیوی پر اعتماد کرے۔ چوری چھپے دیکھے ضرور کہ اس کے بچوں سے دوسری بیوی زیادتی تو نہیں کر رہی۔ مگر ہر وقت بیوی کو کسوٹی پر پرکھتے رہنا بہتر نہیں۔ اس طرح ایک تو بیوی سوچتی ہے شوہر ان بچوں کے سلسلہ میں مجھ پر اعتماد نہیں کرتا اور جب مسلسل اس کا اعتماد مجروح ہوتا ہے تو پھر وہ واقعی ان سے بے پرواہی برتنے لگتی ہے اس ضدی بچے کی طرح جسے یہ پتہ ہو کہ میری فرمائش پر ایک بار تو امی نے انکار کرنا ہی ہے پھر کیوں نہ شروع ہی

سے فرمائش کی بجائے ضد کروں۔ اور اس طرح کا رویّہ جب بیوی اختیار کرلے، تو بظاہر گھرانہ کتنا بھی پرسکون نظر آئے۔ بغور دیکھنے سے احساس ہوتا ہے کہ یہ سکون کہیں نہ کہیں سے مجروح ضرور ہے اور پھر یہ رخنہ بڑھتا بڑھتا جھرنا بن جاتا ہے۔ اس لیے ایسے گھرانے جہاں اولاد سوتیلی ہو وہاں کے میاں بیوی کو عام حالات سے ہٹ کر زندگی گزارنا ہوتا ہے۔ بیوی میں صبر، تحمل اور بردباری زیادہ ہونا چاہیے۔ وہ بات بات پہ بچوں کی شکایتیں نہ کرتی رہے اور میاں کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنا زیادہ سے زیادہ با اعتبار ساتھی بنائے۔ اسے پوری طرح اپنے اعتماد میں لے تاکہ گھرانے کا سکون منتشر نہ ہونے پائے اور بچوں کا مستقبل پوری طرح محفوظ رہے۔

سوتیلی اولاد پر مجھے ایک پرانی کہانی یاد آگئی ہے کہ:

"ایک خاتون جب سوتیلی ماں بن کر نئے گھر میں آئی تو میاں نے تنبیہہ کر دی کہ میرے بچوں کو تمھیں کچھ نہیں کہنا۔ ان پر بے جا حکم نہیں چلانا اور خواہ مخواہ روک ٹوک نہیں کرنا۔

بیوی اس سے بڑھ کر وفادار ثابت ہوئی۔ اس نے پہلی بچی کو پچکار کر ایک طرف بٹھا دینا۔ اس سے نہ کام لینا، نہ کبھی کام کاج کا کہنا، وہ محلے میں سہیلیوں کے ہاں پھر رہی ہے گھوم رہی ہے تو اس نے بالکل منع نہ کرنا۔

مگر اپنی اولاد کو اس نے پوری طرح ماں بن کر پالا۔ بچی کو گھرداری کی پوری تربیت دی۔

اب جو شادی ہوئی تو سوتیلی بیٹی کی گھریلو زندگی سخت ناکام رہی اور

اس کی اپنی بیٹی گھرداری سے پوری طرح آگاہ اپنے گھر کو جنت بنا گئی۔ تب باپ کی آنکھ کھلی اور اسے احساس ہوا کہ دوسری بیوی سے بچی کو خودسر بنا کر اس نے بہتر نہیں کیا۔ مگر اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

ہماری بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ عورت سوئی سے گھر بنا لیتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک لوک کہانی بھی بہت مشہور ہے کہ :

"ایک بادشاہ کے حرم میں زمانے کے دستور کے مطابق چند بیگمات تھیں اور ان میں ذاتی حسد و رقابت چلتی رہتی تھی۔ ایک ملکہ کفایت شعار اور باعمل قسم کی خاتون تھیں۔

دوسری پھوہڑ تھی ایک دن اس نے بادشاہ سے شکایت کی کہ بڑی ملکہ آپ کی بادشاہت کو ہیچ سمجھتی ہے اور کہتی ہے کہ عورت کو خود بھی کام کرتے رہنا چاہیے۔

بادشاہ نے اپنی سخت توہین محسوس کی اور اسی وقت بڑی ملکہ کو بلا کر کہا کہ مجھے معلوم نہ تھا تم ملکہ بن کر باندیوں ایسا سوچو گی۔ آج سے ہم تمہیں اپنے حرم سے الگ کرتے ہیں — بولو — یہاں سے کیا چیز اپنے ساتھ لے جاؤ گی ؟

ملکہ نے اپنی پٹاری میں سے سوئی ساتھ لے جانے کی اجازت چاہی اور جلاوطن ہو کر جنگل میں چلی گئی۔

وہاں اس نے سوئی سے پھولوں کے ہار پرونے کے علاوہ گجرے اور بینی بھی گوندھے اور ایک چرواہے کی مدد سے بازار میں بیچ دیتی سوئی کی مدد سے اس نے بڑے بڑے پتوں کو جوڑ جوڑ کر لباس تیار کیا اور سوئی ہی سے گاؤں کے لوگوں کے کپڑے سیتی رہی۔ رفتہ رفتہ

اس کے پاس پیسے اکٹھے ہو گئے تو اس نے اپنا جھونپڑا بنا لیا۔ جھونپڑے کی جگہ مکان بن گیا۔ مکان میں اشیاء آ گئیں اور اس نے سوئی سلائی کرنے والی اور بھی عورتیں اپنی مدد کو رکھ لیں۔ ان دنوں مشینیں تو ہوتی نہ تھیں۔ عورتیں ہاتھوں سے کپڑے سیا کرتی تھیں۔ اس لیے وہاں کپڑے سلوانے والی عورتوں کا ہجوم ہوتا۔

ملکہ یہاں بھی بڑے وقار سے کام کرواتی اور آنے والی عورتوں کی ہر فرمائش پوری کر دینے کا وعدہ کرتی۔

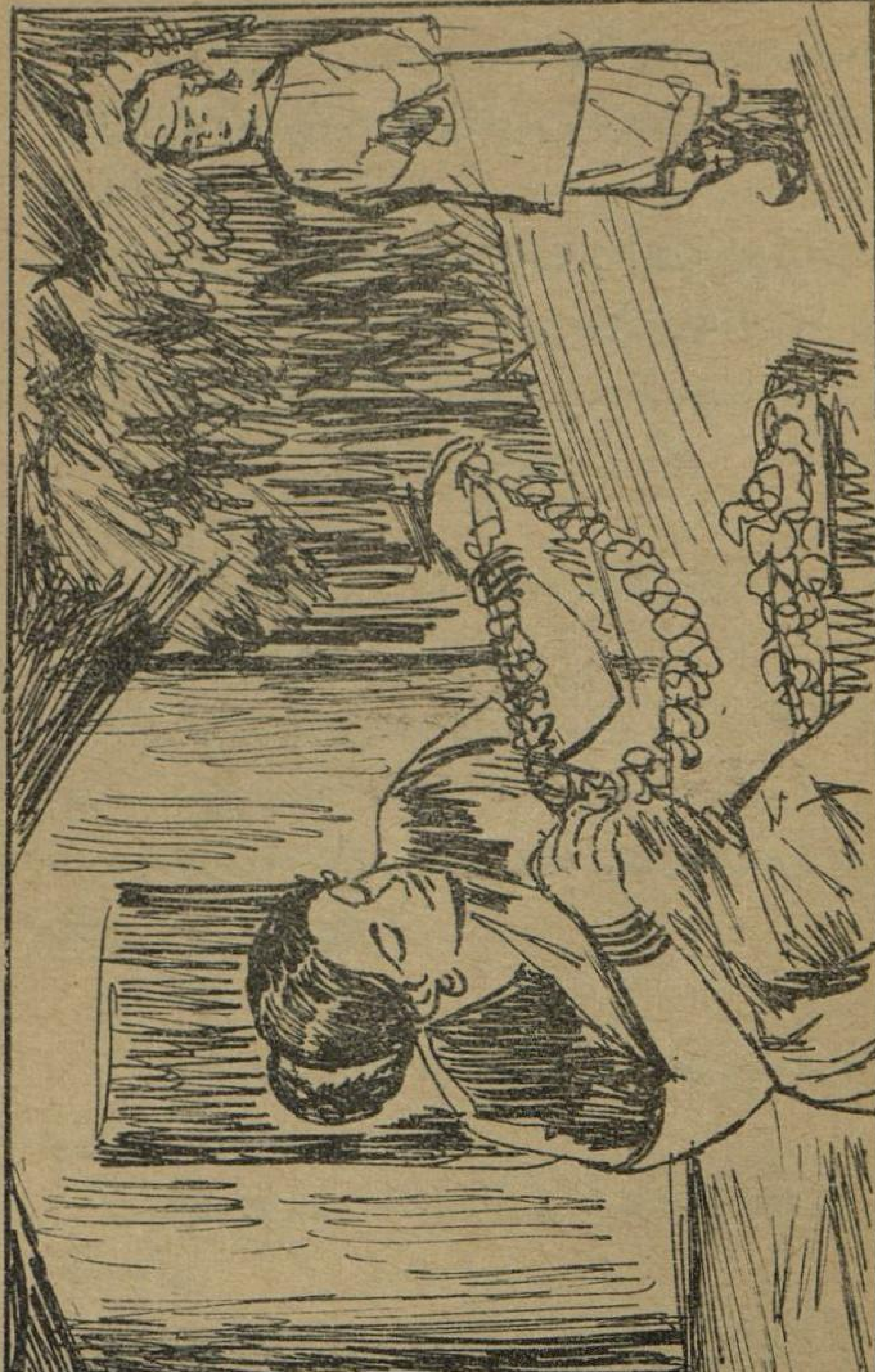
بڑی عزت کی زندگی بسر کرتی رہی۔

قدرت خدا کی — بادشاہ کی اس پھوہڑ باندی سے ان بن ہو گئی اور اس پھوہڑ عورت نے انتقام لینے کو دشمن سے ساز باز کر لی۔ ایک رات بادشاہ کو جان بچانے کے لیے گھر سے بھاگنا پڑا — اور اس نے پناہ بھی لی تو اپنی اسی ملکہ کے ہاں — جس نے اب سوئی کی مدد سے بہت زیادہ خوب صورت گھر بنا لیا ہوا تھا اور علاقے بھر میں بڑی باعزت اور باوقار خاتون مانی جاتی تھی۔

اس نے بادشاہ کو پناہ دے دی۔

وہاں رہ کر، اس کے علاقے کے لوگوں سے مل کر بادشاہ نے دوبارہ اپنے تخت پر قبضہ کر لیا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ عورت اگر سمجھ دار ہو تو وہ سوئی کی مدد سے بھی گھر بنا سکتی ہے اور تخت پر بھی قبضہ کر لیتی ہے۔"

شاید اس پرانی کہانی ہی کے عملی کردار سے متاثر ہو کر قدیم رومن شادی سے قبل عورت کی کلائی کے چکر گنا کرتے تھے۔ اس طرح کرنے کے لیے وہ ہتھیلی



کا جھکاؤ اندر کلائی کی طرف کرتے۔ اس طرح کرنے سے چکر پورے نہیں ہوتے تو وہ سمجھ لیتے کہ یہ باعمل خاتون ثابت ہوگی اور خاوند کی ہر حالت میں مدد کرے گی۔ ایسی لڑکی کے کئی خواہش مند پیدا ہوتے۔

ایشیائی لوگوں میں عورت کی کئی اقسام تھیں اور ایسی عورت کو بیوی بنانا فخر سمجھا جاتا جو پدمنی ہو۔ جس کا دہن چھوٹا ہو۔ اس سے مراد یہ لی جاتی کہ وہ شوہر کی رازدار ہوگی۔ شوہر اس پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کر سکتا ہے۔ آہستہ بولتی ہو نرم گفتار ہو کہ اس کی گفت گو مرد کے لیے باعثِ سکون ہوگی۔

اس کی پلکیں جھکی جھکی ہوں۔

کہ اپنے مرد کے علاوہ کوئی اس کی آنکھوں میں نہ جھانک سکے۔

اور نہ وہ کسی اور کی طرف دیکھ سکے۔

اس کے قدم چھوٹے ہوں کہ وہ تیز رفتاری میں مرد سے آگے نہ نکل جائے۔ ہمیشہ مرد کے پیچھے رہے۔

یہ سب وفادار، باسلیقہ عورت کے لیے استعارے اور کنائے ہیں کہ مرد ہر حال میں ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ :

اس کا گھر ایک جنت ہو۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ مرد کے متعلق مشہور ہے کہ اسے ہمیشہ بچے اپنے اور بیوی دوسرے کی پسند ہوتی ہے۔

مگر مرد اپنی بیوی سے یہ توقعات رکھتا ہے کہ وہ اسے پُرسکون گھریلو زندگی عطا کرے گی۔

ہر عورت بھی یہی چاہتی ہے کہ اس کا گھر دوسروں سے بہتر ہو یہی وجہ ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنی ذات سے بہتر صفات والا مرد اپنا آئیڈیل بنایا ہے خاوند

کے لیے ۔ کہ وہ بہتر مرد کی رفاقت میں دوسروں سے بلند اور بہتر ہو۔

میں اکثر ایسی خواتین کو جانتی ہوں جو انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنے شوہروں کے لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ انھیں ہمیشہ بہت اچھی حالت میں باہر بھیجتی ہیں کہ شوہر ۔۔ ان کی پسند کا عکس ہوتا ہے اور وہ کسی طور بھی بدذوق کہلوانا نہیں چاہتیں۔

٭

ازدواجی زندگی کے بھرپور پچاس برس گزارنے والی خواتین سے ملاقات ہوئی۔ ایک تو قطعی گھریلو خاتون تھیں مگر جن کی اولاد بڑے بڑے مرتبوں پر فائز تھی۔

ان سے پوچھا :

"پچاس سالہ رفاقت آپ کی کیسی رہی ؟"

وہ بولیں :

"زندگی کے پچاس سال بڑے سہانے گزرے ہیں۔ ہماری رفاقت بڑی بھرپور رہی ہے۔"

میں نے پوچھا :

"آپ دونوں عمر کے آخری دور میں ہیں۔ یہاں عمر اور خیالات کا سمجھوتہ نظر آتا ہے مگر اوائل عمر آپ نے کیسے گزاری ؟ کچھ آپ کے میاں نے آپ سے سمجھوتہ کیا ہے ؟ یا آپ نے ان سے — ؟"

انھوں نے جواب دیا :

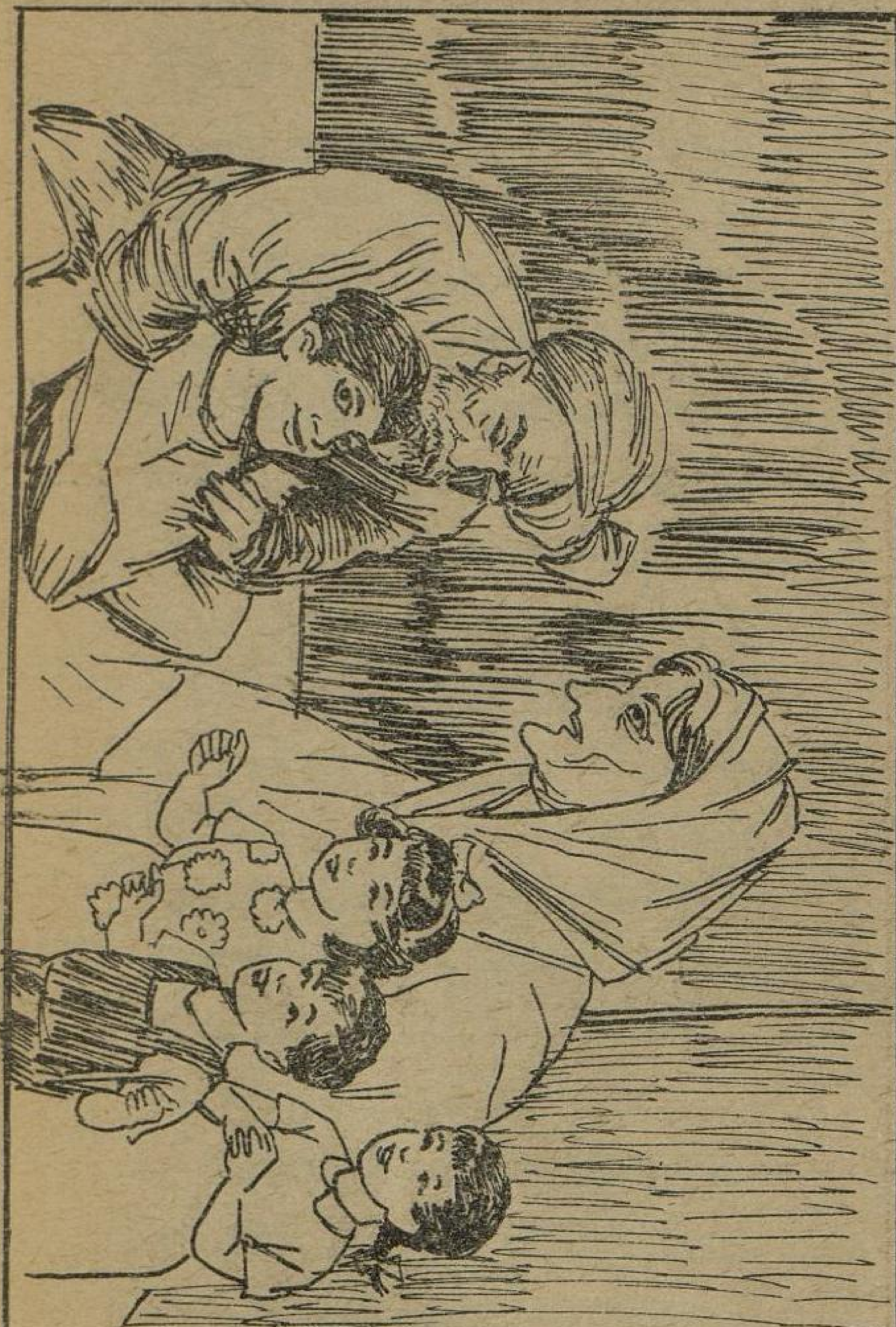
"سیدھی بات تو یہ ہے کہ میرے میاں انتہائی گرم مزاج ہیں جو اس عمر میں بھی کم نہیں اور میں قطعی ٹھنڈے مزاج کی عورت ہوں۔ میں اکثر سوچا کرتی ہوں اگر ہم دونوں ایک مزاج کے ہوتے تو یہ گھرانا اتنا پرسکون نہ ہوتا۔ شروع میں ہی میں نے ان کا مزاج سمجھ لیا تھا۔ یہ جہاں

اونچا بولتے - میں مسکرا کر کمرے سے نکل جاتی - یہ لوگ کر غصہ نکال لیتے، میں چپکے سے بیٹھی کام کرتی رہتی - اس طرح میں ان کی نظروں میں "کم زبان" ہو گئی - بعد ازاں کئی بار جواب دینا بھی پڑتا تو انھیں سن کر زیادہ محسوس نہ ہوتا - ہمارے وقتوں میں بی بی پردہ بہت تھا - ہماری آواز بھی ان کے دوستوں تک پہنچ جاتی تو باعث شرم تھی - گھر میں مرد ملازم بھی رکھا نہ جاتا تھا - ہمارا احول یہی تھا ہم نے کبھی اپنی رسمیں اپنی روایات ترک کرنے کی ضد نہ کی تھی - پھر جوں جوں حالات بدلتے گئے ہم میں ہمارے گھرانوں میں تبدیلیاں آتی گئیں اور میں یہ بات بڑے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ہم نے بہت کچھ اپنے پر جبر کر کے زندگی کے نئے تقاضوں کا ساتھ دیا - بچوں کو دنیا کے مطابق بنانے میں میرا زیادہ ہاتھ ہے - یہ تو لڑکیوں کی بہت زیادہ تعلیم کے خلاف تھے مگر میں نے دھیرے دھیرے سمجھایا تو یہ مانتے چلے گئے۔

اسی طرح شادی بیاہ ہوئے۔

اب تک میری یہ حالت ہے کہ میں اپنے میاں کے دوستوں سے پردہ کرتی ہوں - برقع تو نہیں لیتی مگر ان کے سامنے نہیں آتی - ہاں اپنے بچوں کے دوستوں عزیزوں سے ملتی ہوں۔

ہماری بھی رنجشیں اور لڑائیاں ہوتی تھیں مگر روٹھ کر



میکے جانے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ انھیں بہت سی اپنی باتیں منوانے کی عادت ہے، میں چپکے چپکے مانتی چلی گئی مگر جہاں میری بات چلی میں اپنی بات منوا کر رہی۔ اب میں اپنے پوتوں اور نواسوں کی بیویوں کو دیکھتی ہوں۔ آج کل کی عورت میں ناز اور نخرہ زیادہ ہے خدمت گزاری کم ــــ ہم اپنی انفرادیت، اپنی حیثیت، اپنی خدمت اور اطاعت گزاری سے منواتے تھے۔ اور وہ دیرپا ہوتی تھی۔ مگر آج کل کی لڑکیاں پہلے اپنی بات منواتی ہیں اور وہ مرد کے دل کو نہیں ذہن کو قابو کرنے کا سوچتی ہیں جو بہتر نہیں۔ دل قابو میں آئے تو ذہن خود بخود اپنا ہو جاتا ہے۔

ہم لوگ اپنی ساس کی بات مانتے تھے بلکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ آج کی لڑکی اکیلی رہنا پسند کرتی ہے اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بزرگوں کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل نہیں کرتی۔ روایات اور خاندانی آداب کو ختم کر دینے میں فخر محسوس کرتی ہے حالاں کہ عورت کا فخر اس میں ہے کہ اسے سسرال کی اچھائی ملے۔ میکے تو ہر ایک کو اچھا کہتے ہیں ــــ عورت وہ اچھی ــــ جسے سسرال والے اچھا کہیں۔ پھر عورت کی کامیابی اسی میں نہیں کہ اس کا میاں اس کے قبضے میں ہے بلکہ کامیاب گرہستی وہ ہے جس کے نیچے اس دنیا میں بے حد کامیاب و کامران ہوں۔ بچوں کے رشتے ناطے کامیاب ہوں، ان کے گھرانے خوش ہوں اور اس گھرہستی سے

اس کے میکے، سسرال اور دیگر عزیز رشتہ دار خوش ہوں۔

میں یہ نہیں کہتی کہ میں نے پچاس برس اپنے میاں کی غلام بن کر گزارے ہیں بلکہ مجھے فخر ہے کہ میں ان کی اچھی ساتھی اور کامیاب بیوی رہی ہوں۔ وہ مجھ سے خوش رہے ہیں اور میں ان سے مطمئن۔"

ان کے میاں سے بات ہوئی۔

تو وہ مسکرا کر بولے:

"اپنی زندگی تو گویا پچاس برس سے کسی اور کے ہاتھوں میں ہے — بھئی ہمارا تو:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہم تو ساری عمر تنخواہ لا کر بیوی کے ہاتھ میں تھما دیتے رہے دوستوں کی دعوتیں بھی کرتے۔ عزیزوں کی شادیوں میں بھی شرکت کی۔ اولاد بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ان کی شادیاں بھی دھوم دھام سے ہوئیں — اب یہ ہمیں نہیں پتہ کہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ میرے مولیٰ کا کرم رہا۔ ہم نے عنانِ حکومت بیوی کے ہاتھ میں دے دی۔ مگر سیانوں نے ٹھیک کہا ہے کہ غافل نہیں ہونا چاہیے۔ شروع شروع میں کبھی کبھی چابک دکھانی پڑی۔ پھر ضرورت نہ رہی کہ ہماری رفیقۂ حیات ہیں سمجھ دار۔ چابک کھائی نہیں۔ دیکھ کر ہی ساری عمر ٹھیک ٹھاک رہیں۔ میری خدمت میں کبھی کوتاہی نہیں کی — اور مرد — گھر کا سکون اور اپنی خدمت چاہتا ہے، وہ سدا مجھے میسّر

رہے۔

اَلحمدُ لِلّٰہ کہ پچاس برس کا عرصہ بڑی عزّت سے گزر گیا۔ اور مجھے احساس ہے کہ جس طرح ہم نے سکون سے زندگی بسر کی ہے اب وہی زندگی اور حالات ناپید ہو رہے ہیں۔ اب نہ مردوں کی وہ عادات ہیں نہ خواتین میں وہ خدمت گزاری اور صبر و ضبط ہے۔ ہم لوگ حالات سے کبھی گھبراتے تھے، تو تھکے ہوئے پرندوں کی طرح سمٹ کر اکٹھے بیٹھ کر پہروں اپنے مسئلے کا حل تلاش کرتے تھے اور کامیاب رہتے تھے، مگر نئی نسل گھر سے باہر زندگی گزارنا پسند کرتی ہے۔ وہ اپنے مسائل اخباروں میں چھپواتے ہیں اور اپنے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنی تنہائیوں میں اضافہ کر لیتے ہیں — اور ازدواجی زندگی کے دوران تنہائی کا احساس بڑا ظالم اور دردناک پہلو ہے — اللہ بچائے !"

اپنی ایک لیڈر خاتون سے پوچھا :

" آپ نے اپنی ازدواجی زندگی کے پچاس برس کیسے گزارے !"

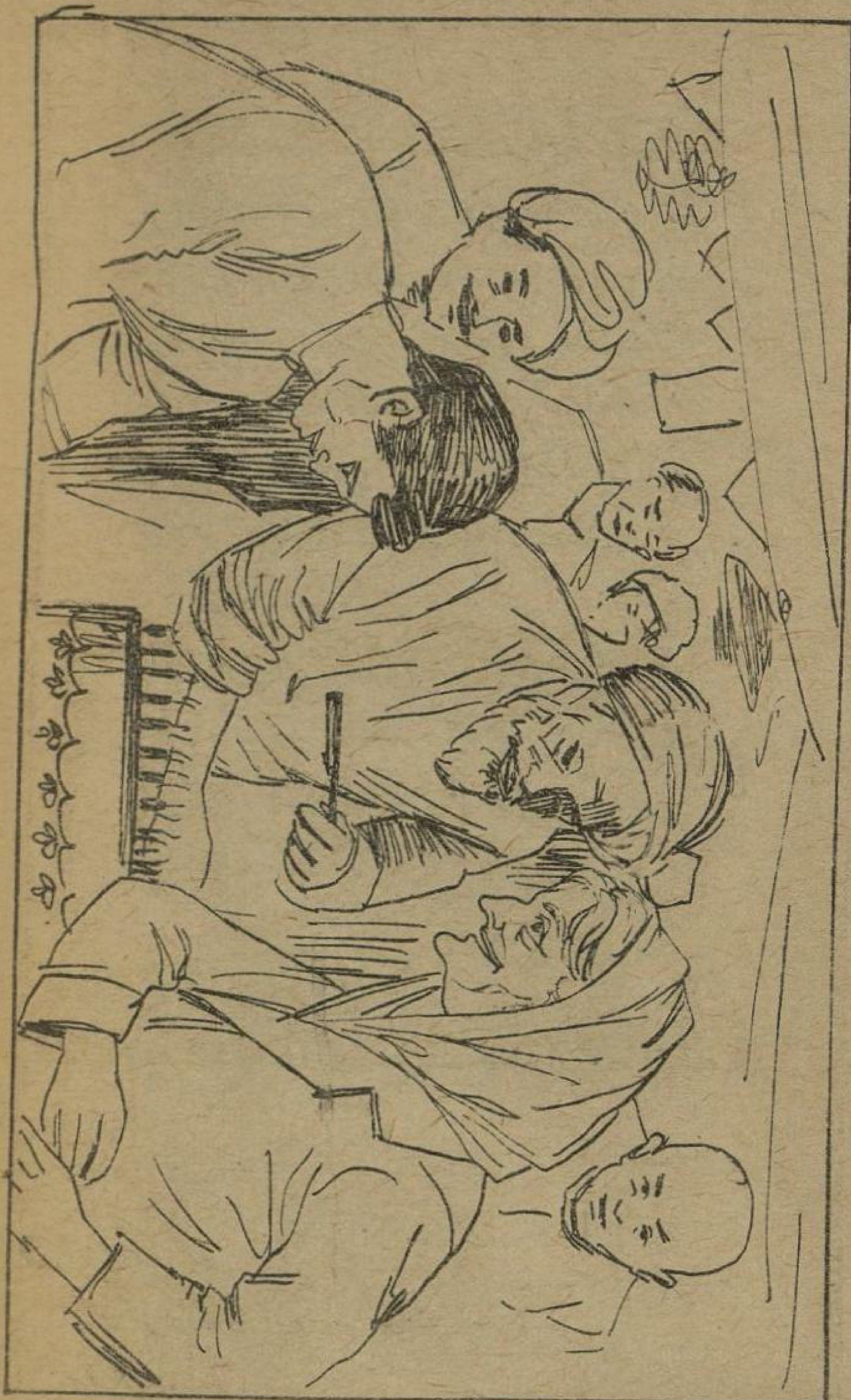
جواب ملا :

" بہت شاندار !"

پھر پوچھا :

" آپ کبھی ایک دوسرے سے اکتائے نہیں ؟"

وہ بولیں :



"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے میاں بے حد اچھے ہیں۔ وہ ہر برس شادی کی سالگرہ اس اہتمام سے مناتے۔ اپنی شادی کا قصہ سب کو مزے لے لے کر سناتے، میری بدحواسیاں، میری شروع زندگی کی ناتجربہ کاریاں سنا سنا کر سب کو ہنساتے۔ میں اب تک جھینپتی رہتی ہوں۔ ہماری زندگی تو مثالی زندگی رہی ہے۔ میں شروع میں شعروشاعری سے معمولی دل چسپی رکھتی تھی۔ ایک آدھ بار انھیں شعر سنایا۔ انھوں نے خوب داد دی۔ پھر میں نے غزلیں کہیں۔ یہ ساری مصروفیات چھوڑ کر میری غزل سنتے۔ داد دیتے، حوصلہ افزائی کرتے بلکہ رسالوں میں اہتمام سے چھپواتے اور پھر رسالے خود ہی سنبھال کر بھی رکھتے۔

پھر تحریکِ پاکستان میں ہم چند خواتین تھیں جنھوں نے حصہ لیا — ہم شروع میں نقاب اوڑھ کر باہر نکلتیں، جلسوں جلوسوں میں شرکت کرتے۔ قیامِ پاکستان کے بعد خواتین کی ذمہ داریوں کو خود انھوں نے محسوس کیا اور جس طرح مشاعروں میں میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی تھی اسی طرح خواتین کی تنظیموں میں میری رہنمائی کرتے۔

ہمارے وقتوں میں نہ آج کل والے آزاد ماحول تھے نہ آزادی — مگر مجھے فخر ہے کہ میرے میاں نے مجھے اپنا پورا اعتماد دیا اور ہمیں نئی زندگی سے آشنا کروایا۔ یہ بات بھی ہے کہ میں نے کبھی ان کا اعتماد مجروح نہیں

کیا۔ وہ جس طرح میری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے گئے میں ان کی عظمت کی قائل ہوتی گئی اور ہماری پرمسرت زندگی دوسروں کے لیے مثال بن گئی ـ (مگر آج کل لوگ "مثال" کی تقلید ہی کہاں کرتے ہیں) ہم لوگ سفید لٹھے کے برقعے پہنا کرتے تھے ـ پھر سیاہ ریشمی نقاب لیے اور پھر پردہ ترک کیا۔ مردانہ مشاعروں، مردانہ جلسوں بلکہ جلوسوں میں گئے، الیکشن لڑے ـ کیا کچھ نہیں کیا مگر اپنے مرد کے اعتماد، بھروسے اور عظمت کے بل بوتے پر، کہ عورت کو بلند اور عظیم بنانے کے لیے مرد کو عظیم تر بننے کی ضرورت ہے۔ کامیاب گھریلو زندگی کے لیے مرد کو پر وقار ہونا چاہیے اور بیوی کو بھی لازم ہے کہ اپنے مرد کی قدر کرے، اس کی عظمت اور بڑائی کو تسلیم کرے ـ ہم نے تو اس دور میں اپنے مردوں سے اپنی بڑائی کا اعتراف کروایا جب عورت کو پیر کی جوتی کا درجہ دیا جاتا تھا۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میرے میاں نے مجھے "اپنے لباس" کا درجہ دیا اور میں نے اسے ایک ایسا لبادہ قرار دیا جس نے سر سے پیر تک مجھے ڈھانپ لیا۔ ہم لوگ اپنی ذاتی گفت گو میں علمی ادبی سیاسی اور مذہبی موضوعات پر بھی بحث کرتے ـ مجھے اعتراف ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی "شدید ضرورت" بن گئے۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میاں صاحب نے مجھے ہمیشہ "صنف نازک" سمجھا (حالاں کہ محترمہ میاں کے مقابلے میں قد آور اور

نمایاں ڈیل ڈول کی ہیں) اس لیے جب کبھی باہر کے ملک میں سیر کے لیے گئے تو پہلے ایک دن خود راستے اور جگہ دیکھ آتے اور پھر دوسرے دن مجھے لے کر جاتے کہ پہلے دن مجھے نئے راستوں پر مشکل یا صعوبت نہ اٹھانی پڑے۔ حج اور عمرہ کے لیے گئے تو وہاں بھی میرا خیال رکھتے۔ میں بیمار ہوتی پرہیزی کھانا کھانا ہوتا تو کہتے یہی کھانا میں بھی کھا لیتا ہوں۔

پچاس برس کی رفاقت کی کیا کیا بات یاد کروں مجھے گزرا ہوا وقت اپنے سے برتر شخصیت کے سائے میں گزرا ہوا سہانا عہد نظر آتا ہے اور سوچتی ہوں ہم لوگ خوش قسمت تھے کہ ہمیں پرسکون ازدواجی زندگی نصیب ہوئی، اس کا سبب یہ تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو 'سمجھنے' 'چاہنے' قدر کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی شخصیت بنائی ہے اسے مجروح نہیں کیا۔"

مجھے اپنی اس بزرگ خاتون کی طویل گفت گو پر اپنی ایک نوجوان شاعرہ یاد آگئیں جو کنوار پنے میں تو ہر مشاعرے میں نظر آتی تھیں جن کی ادبی مصروفیات خاصی وسیع اور حلقۂ دوستاں کا پیمانہ بھی وسیع تھا مگر شادی کے بعد وہ بہت کم نظر آئیں وہ بھی نجی محفلوں میں۔ ان کے چہرے پر عجیب و غریب مایوسیاں بڑھتی چلی گئیں، وہ جو ہوتا ہے شادی شدہ زندگی کا وقار، وہ کہیں نام کو بھی نہ تھا۔

اس لیے میں پوچھے بنا نہ رہ سکی :

"کہو ! کیسی رہی یہ زندگی ؟"

"خاصی مایوس کن۔"

"تمہارا ساتھی کیسا ہے ؟"

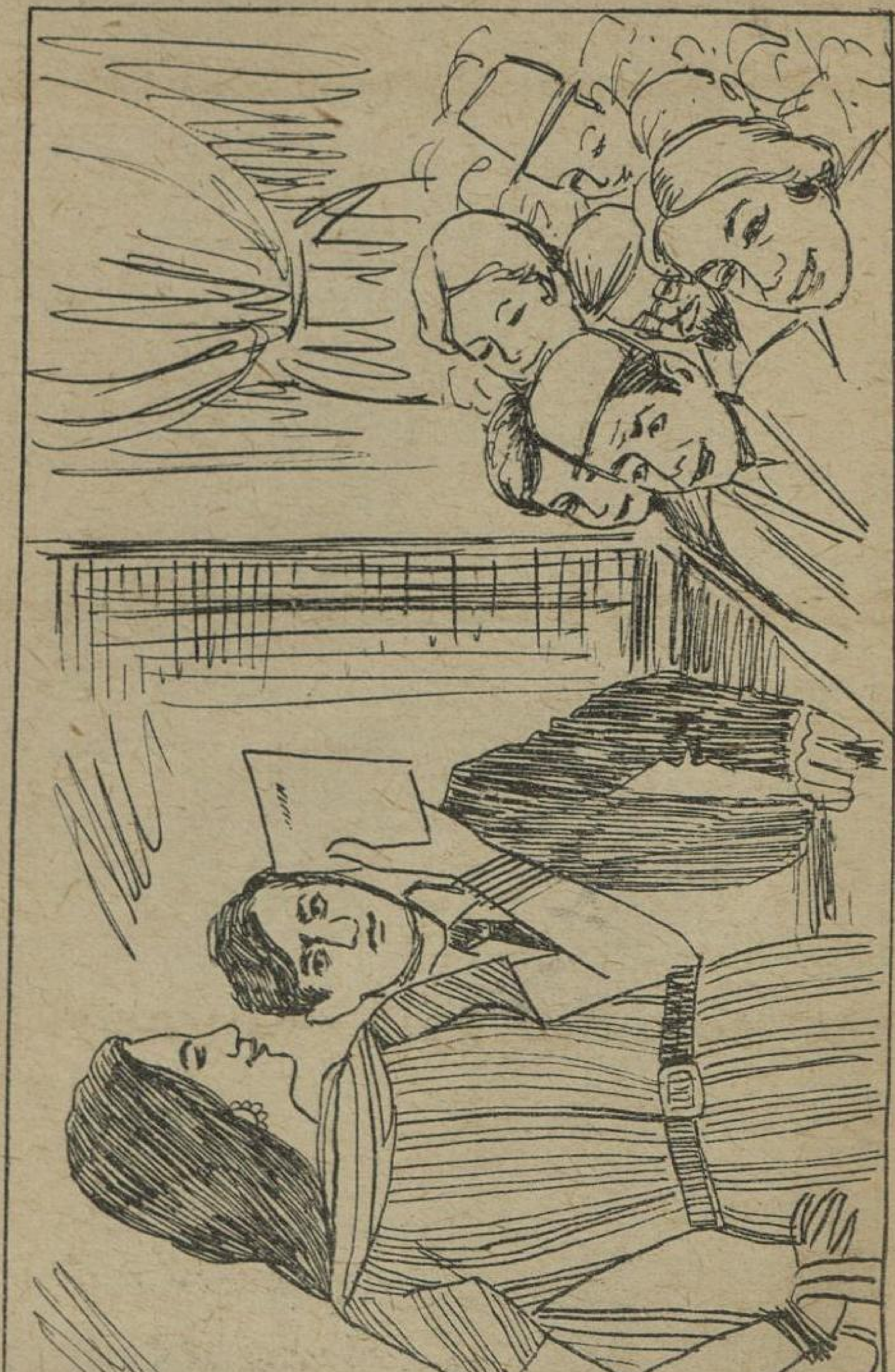
"وہ میرا خاوند ہے۔ ساتھی نہیں۔"

"یعنی ۔ ؟"

"یعنی یہ کہ اسے میرے ادبی مشاغل سے چڑ ہے۔ میری بیاض جہیز والے کپڑوں کے ساتھ کہیں بند پڑی ہے۔"

"بیاض تو چھپا سکتی ہو مگر اپنے اشعار کی "آمد" پر پہرہ کیسے بٹھا سکتی ہو ؟"

"یہی میرا المیہ ہے اور اشعار کی موت میرے چہرے میری آنکھوں اور میرے سراپا پہ چھاتی جا رہی ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری شادی نہیں ہوئی میرا کوئی اپریشن ہوا ہے جس سے میرے کردار میری شخصیت کی نوعیت بدل کر رہ گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں کنوار پنے میں میں کیسے مشاعروں میں جاتی تھی صرف اپنی ذات پر اعتماد کر کے۔ میں نے سوچا تھا میرا خاوند میرے کردار کی پختگی کا قائل ہو جائے گا مگر معاملہ اس کے برعکس رہا۔ وہ شروع میں یہی کھوجتا رہا کہ میں اپنے ماضی کی باتیں کرتے ہوئے کسی شاعر، کسی ادیب کی باتیں زیادہ کرتی ہوں۔ میری سہیلیاں کیسی ہیں۔ پھر وہ میرے ساتھ مشاعرے میں گئے اور ریڈیو پروگرام میں بھی۔ اس کے بعد انھوں نے یوں کہنا شروع کیا :



"دیکھو — اب گھر میں دلچسپی لو۔ یہ بیرونی مشاغل رفتہ رفتہ چھوڑ ہی دو۔"

اور وہی ہوا۔ اب میں بیرونی دنیا سے الگ ہو چکی ہوں۔ میں نے جتنی محنت سے اپنا کردار اپنی شخصیت بنائی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اب میرا شوہر میری شخصیت اپنے مطابق ڈھال رہا ہے۔ وہ کہاں تک کامیاب ہے یہ آپ سب بخوبی میرے چہرے پر دیکھ سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ان کے چہرے پر چھائی مایوسی جیسے ان کے گھر کے کونے کونے میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی وہ ایک پُرمسرت گھرانہ ایک پرسکون گرہستی کا پسندیدہ گھر نظر نہیں آرہا تھا وہاں ہر طرف یہ احساس چھایا ہوا تھا کہ اس میں بسنے والے ایک گاڑی کے پہیے ضرور ہیں مگر انھیں چابی دے کر اس لائن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کے اپنے کوئی ارادے ہیں نہ خواہشات۔ ان کے چہروں پر کوئی امنگ ہے نہ حصولِ مسرت کی تڑپ، بلکہ اس کے برعکس وہاں ایک چیز ہے اور بس —

وہ دونوں چاہتے تو خود گھر کو پرمسرت بنا سکتے تھے اگر شوہر بیوی کی شخصیت مسخ کر کے اپنے مطابق نہ ڈھالتا۔ ڈھالنا ہی تھا تو سہج سہج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھ کر ۔ ۔ ۔ ۔

اپنی ایک اور رہنما خاتون سے ملاقات ہوئی۔

وہ بھی شادی کی پینتالیس ویں سالگرہ منا چکی تھیں۔

اور اپنی پینتالیس سالہ رفاقت پر بہت نازاں تھیں۔

انھیں فخر تھا کہ انھوں نے اپنے خاوند کے سہارے الیکشن بھی لڑے ہیں اور

..... لیڈری بھی کی ہے - فیشن بھی کیے ہیں اور غیر ممالک کی سیریں بھی کی ہیں۔
انھوں نے کہا :

"میں رئیس والدین کی بیٹی تھی - والد نے ہماری تربیت شاندار طریقے پہ کی مگر خاوند نے بھی ساری عمر عیش کرائی — یوں میں نے بھی اپنے آپ کو اپنے خاوند کی خدمت، عظمت اور بڑائی کے لیے وقف کر دیا - بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ میرے میاں پرہیزی کھانا کھاتے تھے - وہ وائسرائے کی دعوت میں بھی جاتے تو اپنا کھانے کا ڈبہ ساتھ لے جاتے - ان کا کھانا میں خود تیار کرتی یا اپنی نگرانی میں تیار کرواتی -

ازدواجی زندگی کی کامیابی کا راز "کچھ دو، اور کچھ لو" کے فارمولے میں پوشیدہ ہے - میں اپنے میاں صاحب کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہمیں نئی روایات کے مطابق اس طرح ڈھالا جیسے ہم بچیوں کو سکھاتے ہیں اور ظاہر ہے اس کے عوض میں نے اپنی تمام تر خدمات ان کے لیے وقف کر دیں - ہم آزاد خیال تو کہلائیں مگر ہم نے ہر حال میں اپنے خاوند کو مجازی خدا کا درجہ دیا - اس کا، اس کے خاندان کا بلکہ اس کی سیاسی جماعت تک کا احترام کیا —
گھروں میں سکون صرف روپے پیسے سے نہیں ہوتا بلکہ باہمی افہام و تفہیم ضروری ہے اور اس کے لیے رشتے ناطے کرتے وقت فریقین کی عادات و خصائل کا پرکھ لینا

ضروری ہے۔ اکثر جگہ روپے پیسے کے بل بوتے پر شادیاں طے پا جاتی ہیں۔ بعد ازاں بچوں کے مزاج نہیں ملتے اور اس طرح شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔ ویسے آج کل کی لڑکی تعلیم یافتہ تو ہے مگر وہ اپنے شوہر کا مزاج سمجھنے میں غلطی کر جاتی ہے یا اسے سمجھنے کی جان بوجھ کر ہی کوشش نہیں کرتی۔ وہ اپنے شوہر سے یہ توقع تو رکھتی ہے کہ وہ اس کے ناز اٹھائے گا اسے اٹھانے چاہئیں ــ مگر خود ــ اس کی خدمت کرنا عار سمجھتی ہے حالاں کہ عورت کو خدمت کرنے میں فخر محسوس کرنا چاہیے۔ مگر آج اکثریت ایسی لڑکیوں کی بڑھ گئی ہے جو ملازمت کرنا پسند کرتی ہیں۔ اپنے باس، اپنے آفیسر کا حکم تو مان لیتی ہیں مگر شوہروں کی تابع داری نہیں کرتیں اس میں اپنی توہین خیال کرتی ہیں۔ سوچ اور فکر کا یہ انداز قطعی منفی ہے اس پر سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ اور مثبت رویّہ اپنانے کی انتہائی ضرورت ــ تاکہ گھرانے پرسکون ہوں......

میری عادت بڑی نفاست پسند ہے۔ میں شروع ہی سے شوخ رنگ پسند کرتی تھی۔ میرے میاں نے ان پر اعتراض نہیں کیا بلکہ میرے ذوق کی ہمیشہ داد دی۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی کیا کہ اپنے میاں کے لباس کا خاص خیال رکھا۔ انھیں باہر جانا ہوتا تو میں بطورِ خاص ان کا لباس چیک کرتی۔ خاص دعوتوں پارٹیوں کے لیے اپنے لباس کے ساتھ ان

کے لباس کا بھی خیال کرتی - ان کی ٹائی ہمیشہ شوخ رنگ کی بنتی، ان کے رومالوں پر تارکشی بھی کر لیا کرتی تھی۔ ان کے لکھنے لکھانے کے ذوق کے پیشِ نظر ان کی لائبریری کو ان کے ذوق کے مطابق سجاتی۔ میری ان باتوں سے وہ ہمیشہ میری قدر کرتے۔

مجھے ایک دفعہ میری ایک دوست نے جو انگریز نسل سے تھی بڑے مذاق میں کہا کہ تم اپنے لباس کے ساتھ اسی رنگ میں اپنے میاں کی ٹائی اور رومال بھی تیار کر لیتی ہو؟

میں نے جواب دیا:

"ہاں — تاکہ جب وہ باہر نکلے تو سب کو پتہ لگے کہ اس پر کس خاتون کی مُہر لگی ہے۔"

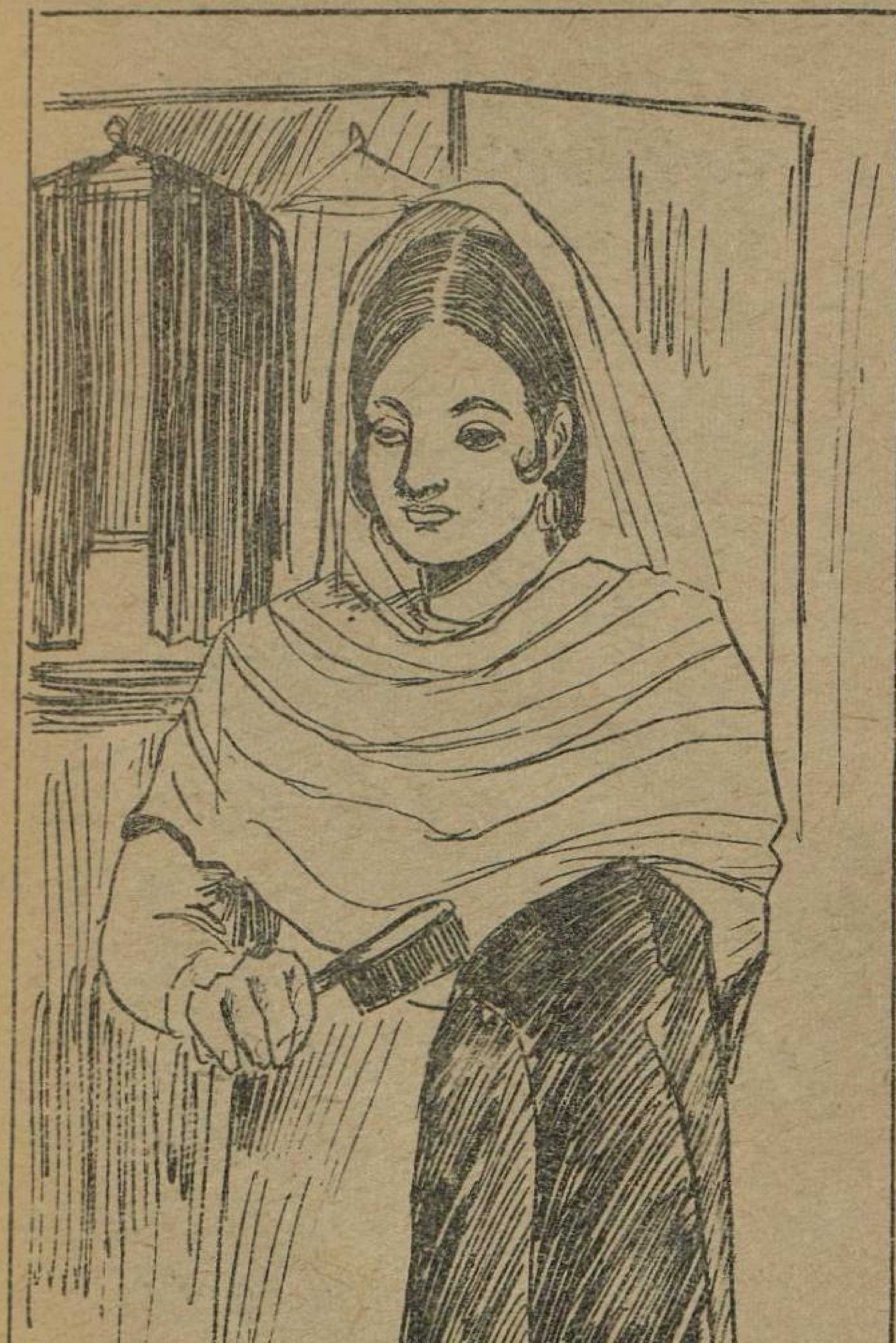
اپنی بزرگ خاتون کی اس بات پر مجھے اپنے دَور کی دو اَور خواتین یاد آئیں۔ ایک نے بتایا کہ:

"میں اپنے میاں کے لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ جب باہر جائیں تو ان کے سُوٹ کو خود برش کرتی ہوں۔ ان کے سویٹر ہمیشہ شوخ رنگوں میں خود بُنتی ہوں اور پھر انھیں پہنا کر خوش ہوتی ہوں۔"

میں نے پوچھا:

"ایسا کرنے سے آپ اپنی کون سی حِس کو سکون دیتی ہیں؟"

وہ بولیں:



"مجھے گھر میں یہ اطمینان رہتا ہے کہ باہر سب لوگ کہتے ہوں گے اس کی بیوی خاصی باذوق ہے پھر جب بھی کوئی دوست ان کے کپڑے، ان کے سوئیٹر، ان کے لباس کی تعریف کر دیتا ہوگا تو انھیں میں شدت سے یاد آتی ہوں گی اور اسی لمحہ وہ میرے بارے میں ضرور سوچتے ہوں گے۔ میری پسند پہ آپ ہی آپ اطمینان سے مسکرا دیتے ہوں گے، اور اس طرح ان کا چہرہ کتنا خوش اور کیسا پرسکون لگتا ہوگا۔

یقین کرو یہ سب کچھ تصوّر ہی میں مجھے بہت سکون دیتا ہے۔ جب وہ گھر آئیں اور میری سوچ میرا تصوّر سچا نکلے تو بس میں خوشی سے جھوم اٹھتی ہوں۔ یوں میں گھر کے باہر بھی اپنے میاں کے ساتھ ساتھ رہتی ہوں۔ ان کا سکون بنتی ہوں۔"

مگر،

دوسری خاتون کے شوہر کو شکوہ تھا کہ :

"جب سے شادی ہوئی ان کا ذوق ختم ہوگیا۔"

"کیوں ؟"

"یہ مجھے اچھا لباس پہن کر باہر نہیں جانے دیتی۔"

"کیوں ؟"

"انھیں خدشہ رہتا ہے کہ میں اچھے لباس میں زیادہ سمارٹ نظر آتا ہوں، اور اگر میں سمارٹ نظر آؤں گا تو کسی دوسری عورت کو پسند آؤں گا اور وہ نہیں چاہتیں کہ ان کا میاں کسی اور کو پسند آجائے......"

ان کی یہ منطق سمجھ نہیں آسکی۔ شاید وہ اپنے پھوہڑپنے کو چھپانا چاہتی ہوں۔ اور اس طرح وہ اپنے شوہر کی خوشنودی بھی حاصل نہیں کر سکیں۔

دیکھا جائے تو شوہر کی ظاہری ٹیپ ٹاپ، فیشن اور لباس، بیوی کے ذوق و پسند کا آئینہ ہوتا ہے۔ پھر نہ جانے خواتین یہ کیوں چاہتی ہیں کہ ان کے مرد دو مردل کو نہ بھائیں۔ اگر اسی طرح خاوند بیوی کے فیشن اور لباس پر اعتراض کرے تو وہ دن میں دس مرتبہ خاوند سے لڑائی کرے۔

ویسے یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ عورتیں اپنے مردوں کی پسند کا لباس پہنتی ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتی ہیں جس سے ظاہر ہے کہ ان میں افہام وتفہیم کی فضا قائم ہے اور وہ — تو من شدی تو من شدی — کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ جہاں

به مے سجاده رنگین کن
گرت پیرِ مغاں گوید

کا اصول چلتا — اور پوری طرح جائز ہے۔

٭

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ محبت کی شادیاں ناکام ہوتی ہیں۔

اس کا سبب پہلا تو یہ ہے کہ :

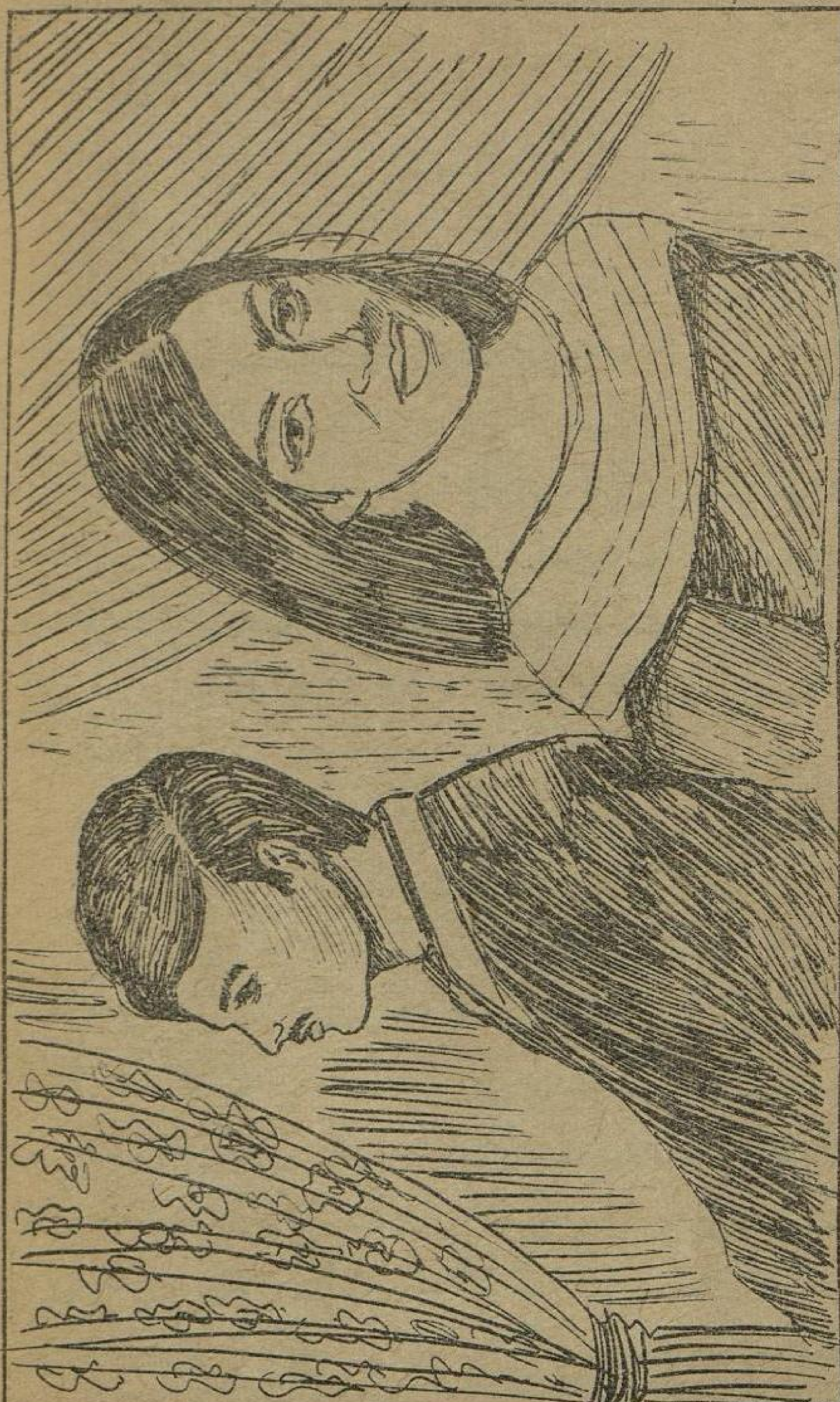
جب ایک لڑکا، ایک لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو لڑکی سمجھتی ہے کہ وہ اپنی ساری عزیزداریاں ترک کر کے صرف اسی کا ہو گیا ہے۔ مگر اس کے بعد جب شادی ہوتی ہے اور وہ دیکھتی ہے کہ مرد کی ساری زندگی میں اسے صرف ایک خانہ ملا ہے۔ "بیوی" کا۔ باقی خانوں میں باپ بھائی، ماں بہن اور دوست پہلے سے براجمان ہیں تو اس کی انا کو پہلا "دھکا" لگتا ہے۔

وہ سوچتی ہے :

یہ سب کیسے ہو گیا ؟ اسے تو صرف اسی کا بن کر رہنا تھا۔

اپنی انا کی اس پہلی شکست یا ضرب کو وہ بے طرح محسوس کرتی ہے اور پھر خاوند کا دل جیتنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اسے اس کے عزیزوں سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگتی ہے اور ساری ناکامی کی بنیاد یہی قدم ہے۔ وہی غلطی...

دوسری بات یہ کہ جب دونوں محبت یا دوستی کرتے ہیں تو صرف اپنی اچھائیاں ظاہر کرتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی کوئی کمزوری کوئی برائی دوسرے فریق پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب بے تکلفی کے ماحول میں آتے ہیں تو ساری پوشیدہ برائیاں باہر آجاتی ہیں۔ یوں بھی اپنے آپ کو ضبط کیے کیے وہ اکتا جاتے ہیں اور اپنے پر جبر کرتے ہیں اور ذہن میں سوچتے یہ ہیں کہ یہ جبر و ضبط کی ساری



مصیبت فریقِ ثانی کی لائی ہوئی ہے۔ یوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگتے ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی اصلیت اور حقیقت پر پردہ نہ ڈالیے بلکہ دوستی اور محبت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کو دھوکا نہ دیا جائے۔ وہ کیسی محبت ہے جو محبوب سے دھوکا کرنے سے گریز نہیں کرتی جس سے صاف ظاہر ہے یہ محبت نہیں ہوتی۔ محض وقتی خواہش ہوتی ہے کسی شخص کے حصول کی۔ یا شخص سے بڑھ کر، اس کی شخصیت، امارت، قابلیت، ذہانت، اعلیٰ ملازمت، ذاتی وجاہت پر اپنے مالکانہ حقوق جتانے کی ــ اور ــ اس خواہش کی تکمیل کے لیے انسان خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتا ہے۔

میری ایک دوست ایک دن میرے پاس آئیں۔

اور بولیں :

"تم فلاں لڑکی کو جانتی ہو؟ میرے بھیّا سے اس کی بڑی دوستی ہے۔ میں چاہتی ہوں دوستی کو غلط رنگ دینے سے بہتر ہے ان کی شادی طے کر دی جائے مگر میں ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ وہ لڑکی اپنے گھر کا پتہ نہیں بتاتی ــ ہمیشہ کسی ہوٹل یا پارک میں بھیّا کو ملتی ہے۔ بہت کرید کے بعد اس نے بتایا ہے کہ اس کی ماں سوتیلی ہے اور وہ اس کی اچھی جگہ شادی نہیں کرنے دینا چاہتی۔ مجھے اس پر ترس آیا ہے اور میں چاہتی ہوں۔ میں براہِ راست اس کے گھر جا کر ان لوگوں سے بات کروں۔ پھر کوئی اتہ پتہ لوں۔ کون لوگ ہیں۔ محلّہ برادری میں کیسی ساکھ ہے؟ وغیرہ ــ"

میں نے اپنی دوست کی طویل بات سننے کے دوران یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ خلوص سے شادی کا پیغام لے کر جانا چاہتی ہے۔ مگر لڑکی کے اور ان کے گھرانے کے معیار کا خاصا فرق تھا۔

یہ لوگ خوب صورت کالونی میں موڈرن بنگلے کے مکین تھے اور وہ اندرون شہر ایک گلی کے باسی۔ یوں لڑکی اپنی تعلیم کے دوران بہت ہی جدید ہو گئی تھی۔ گھر سے برقع لے کر آتی اور کالج آتے ہی اتار کر یہاں سے باہر سیر وغیرہ بھی کر آتی۔ دوستیاں بھی سنبھالیتی۔ ساڑھی اور بغیر آستین کے بلاؤز پہن کر — سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر بھی چلی جاتی۔

میری ایک اور واقف خاتون ان کے علاقے کی تھیں۔ ان سے پتہ لیا اور ان کے گھر جانے کا پروگرام بنایا۔

اس کی ماں کے بارے میں معلوم ہوا کہ سوتیلی نہیں سگی ہے۔ تب ہم اپنی رہنما کے ساتھ ان کے گھر تک گئے۔

اندھیری سیڑھیوں کو طے کر کے ہم دالان میں داخل ہوئے اس کے پیچھے دو کوٹھڑیاں اور تھیں۔

ہم دالان کے ایک بستر پر بیٹھنے لگے تو اس خاتون کی اماں جو ابھی تک ہمیں حیرت سے تک رہی تھی میرا کندھا زور سے ہلا کر مجھے بیٹھنے سے روکتے ہوئے بولی :

"سنبھل کر، دیکھ کر — اس لحاف میں مرغی بیٹھی ہے انڈا دینے کے لیے۔"

ہم تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی نہ تھی۔

ویسے میں نے دل ہی دل میں اس لڑکی کو داد ضرور دی جو اپنے اس گھر سے نکل کر

باہر اتنے اونچے گھرانے کے لڑکے کو اپنی مظلومیت کے قصے سنا سنا کر پاگل کر چکی تھی ان کے ماحول، ان کے گھرانے، ان کے محلے اور عزیزوں کا جائزہ لے کر لڑکے کی بہن بے حد مایوس ہوئی اور اس نے گھر واپس آتے ہی اپنے بھائی سے کہا:

"پہلے جا کر اس لڑکی کا دماغ ٹیسٹ کرواؤ — وہ پاگل ہے — جو اپنے ماحول سے فرار حاصل کرنے کے لیے تمہارا سہارا لے رہی ہے اور تمھیں محبت کا فراڈ لگا رہی ہے۔ یاد رکھو وہ لڑکی لاکھ کوشش کرے فرار کی — مگر اس کی جڑیں وہاں مضبوطی سے گڑی ہوئی ہیں۔ تم یہ بتاؤ! ماحول کی یہ دورنگی تم قبول کر لوگے؟ اور یا پھر تم اپنے لیے کون سا ماحول پسند کروگے؟

دیکھو بھیّا کل کلاں کو تم کورٹ میرج کر کے بعد میں واویلا کرتے پھرو کہ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اپنی محبت کا ابھی جائزہ لے لو کہ تم ایک دوسرے سے محبت کرتے بھی ہو؟ یا محض ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے ہو — شادی کے بعد رونے اور طلاق کے مقدمے میں جان ہلکان کرنے سے بہتر ہے کہ اس محبت پر دو حرف بھیج کر اطمینان سے بیٹھ جاؤ —!"

اور وہی ہوا۔

یہ سب کچھ سنتے ہی بھیا جھٹ سے بولے:

"ہے کچھ فلرٹ ہی — اچھا ہی ہوا جان بچ گئی۔"

اور یہ سب کچھ سن کر مجھے محسوس ہوا کہ محبت کا مضبوط قلعہ دھڑام سے

نیچے آن رہا ہے اور اب کہیں کہیں سوکھی بیلیں لٹک رہی ہیں۔

یہ تو بات شادی سے پہلے کی ہوئی۔

شادی کے بعد اکثر عاشق و معشوق ایک دوسرے سے بیزار اور اکتائے رہتے ہیں اور دونوں ہی یہ شکایت کرتے ہیں:

"ہائے — میں نے تو اسے کچھ اور سمجھا تھا — مگر — یہ کچھ اور ہی ہے۔"

اور اس وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ "یہی کچھ اور سمجھنا" ہی تو بنیادی غلطی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد زندگی میں پرابلم بھی آتے ہیں۔ مشکلات بھی پیش آتی ہیں۔ نئے حالات، نئے تقاضے، خاندانی رسومات اور خاندانی روایات کے مطابق طے شدہ شادی کے بعد یہ ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی اپنے پرابلم اپنے عزیزوں کے پاس لے جاتے ہیں۔ اور بزرگ جنھوں نے یہ رشتہ طے کیا تھا وہ ان کے مسائل کا حل تلاش کر لیتے ہیں مگر بزرگوں سے دور ہو کر اپنی مرضی سے کروائے ہوئے رشتے کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ پھر کوئی بزرگ ان کے مسائل کا حل تلاش کرنے نہیں آتا۔ کوئی مشورہ بھی نہیں دیتا۔ بلکہ دور بیٹھ کر تماشا دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں حالاں کہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے، کہ بزرگوں کے کیے ہوئے رشتوں ناطوں میں بے حد پیچیدہ پرابلم بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مگر والدین اسے سرسری درجہ دیتے ہیں اور خود کروائی ہوئی شادی میں معمولی بات کو تبنگڑ بنا لیا جاتا ہے۔

اس لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ:

شادی طے پاتے وقت اپنے بزرگوں کو درمیان میں ضرور لائیں۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے تو نہ لڑکی اپنے عزیزوں سے

دُور رہ سکتی ہے نہ لڑکا اپنے رشتہ داروں سے۔ اس لیے اس سے قبل کے خاندانوں میں رنجش بڑھے - یہ فیصلہ شروع دن سے کر لینا چاہیے۔

بہت سی "محبت کی شادیاں" جو ناکام ہوتی ہیں تو ان کے پیچھے شک وشبہات کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ایک صاحب سے ان کی ناکام شادی کی بات ہوئی تو وہ فرمانے لگے :

"دراصل وہ بہت آزاد تھی - میرا خیال تھا کہ میں اسے اپنے ڈھنگ پر لے آؤں گا - مگر جناب عورت تو مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے نا ! اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو تو ٹوٹ جاتی ہے اس لیے ہم نے یہ رشتہ ہی توڑ دیا۔"

" مگر آپ نے اسے سمجھانے یا اپنے مطابق ڈھالنے کے کیا طریقے آزمائے تھے ؟"

انھوں نے جواب دیا :

" وہی جو مرد کو آزمانے چاہئیں - میں نے اسے کہا کہ اب تم نے بہت پھر الیا ہے لہذا اب باہر کے ناطے ختم کرو - مگر وہ یہ بات ماننے میں اپنی توہین خیال کرتی تھی - میں ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ میری عدم موجودگی میں اس کا کوئی پرانا دوست اسے ملنے آئے - یا - وہ کسی دوست سے ملنے باہر جائے . . . مگر وہ مانی ہی نہیں - الٹا مجھی پر پابندیاں عائد کرنے اور پہرے بٹھانے لگی۔"

"کیا آپ نے اپنے مشاغل ترک کیے تھے ؟"

وہ بولے :

"میں کیسے کر سکتا ہوں — اب ۴۷ برس کی عمر میں آن کر میں اپنے آپ کو نئے سانچے میں ڈھالوں گا — آخر میرا بھی تو حلقہ ہے۔ میرے بھی دوست ہیں — میں انھیں کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا :

"تو قبلہ آپ کی بیوی بھی تو چونتیس برس کی تھیں۔ نفسیات میں ایم اے کرنے کے بعد اچھی بھلی ملازمت پر تھیں۔ ان کی علیحدہ ایک شخصیت تھی۔ ان کا بھی ایک حلقہ تھا۔ آپ اچھا بھلا جانتے تھے۔ پھر آپ نے یہ کیوں محسوس نہ کیا کہ وہ اس وقت اپنے میں تبدیلی لائے گی جب آپ تبدیل ہوں گے۔ آخر بیوی کی بھی تو "انا" ہوتی ہے پھر آپ مرد لوگ جب بہت سی نئی باتوں، جدید قدروں کو قبول کرتے ہو تو بیوی کے معاملے میں کیوں بخل سے کام لیتے ہو، اور جب بیوی بھی آپ نے اپنی پسند کی (اپنی روایات کو توڑ کر) اپنائی ہو ......"

وہ صاحب ہنسے اور بولے :

"بس سمجھ لیجیے — ابھی مرد میں کچھ پرانی قدریں موجود ہیں اور وہ ہیں — کہ — بیوی ان کی ذاتی ملکیت ہے — اور بس —"

ان کی بیوی سے بات ہوئی۔

تو وہ بولیں :

"دیکھیے رفعت ! انھیں میرے مشاغل اور میرے حلقے کا اچھی طرح علم تھا مگر جب یہ اپنی بات پہ اڑے رہے کہ

شادی کرواکر ہی دم لوں گا۔ میں نے شادی سے قبل کہا کہ میں ملازمت ترک نہیں کروں گی۔ اس وقت تو یہ مان گئے مگر بعد میں یہی بات متنازعہ بن گئی۔ آفس میں مجھے دیر ہوتی تو گھر آتے ہی جیسے میرے سراپا کو سونگھ ڈالتے۔ الٹے سیدھے سوال کرتے۔ میں تو ان حالات سے بے حد گھبرائی۔ پھر جب میں کہتی کہ آپ میرے ساتھ چلیے۔ میرا کوئی ملنے والا آتا تو انھیں کہتی کہ چلو اس سے مل لو۔ یہ الٹا مجھے غصے ہوتے کہ تمھیں ملنے کوئی آئے ہی کیوں.... بات بات پر شک کرنا تو ان کی عادت بن کر رہ گیا تھا اس لیے میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ علیحدگی اختیار کرلی جائے۔"

"مگر آپ لوگوں میں تو "بڑی محبت" تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولیں :

"محبت — ؟ نہیں ! — اب سوچتی ہوں وہ محض چند خوش فہمیاں اور کچھ غلط فہمیاں تھیں جو ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کے متعلق فرض کرلی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کی آئیڈیل ہوں۔ مجھے پاکر وہ اب کسی دوسری عورت کی طرف نہیں دیکھے گا۔ میری قدر کرے گا مگر اس نے تو مجھے یوں سمجھ لیا کہ جیسے میں حق مہر سے خریدی ہوئی اس کی لونڈی ہوں۔"

"کیا آپ نے شادی سے قبل اپنے نظریات کا تبادلہ نہیں کیا تھا؟"

انھوں نے جواب دیا :

"کیا کرتے تھے مگر جب تو یہ کہتے تھے کہ ہیں بہت ماڈرن خیالات کا ہوں۔"

"ویسے معاف کیجیے آپ نے بھی تو اپنے خاوند میں اپنے آئیڈیل کا پرتو ضرور پایا ہوگا۔ آپ نے بھی تو وعدے کیے ہوں گے۔ مگر اب ...."

"دیکھیے تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ جب یہ بولے تو پھر میں کیوں نہ بولوں۔"

"اور.... وہ.... محبت؟"

"صاف صاف کہوں؟"

"ہاں!"

"وہ جو بڑی ارفع شے ہوتی ہے جسے محبت کہا جاتا ہے — ہماری محبت یہ کچھ نہ تھی — یہ ایک قسم کا کاروباری سمجھوتہ تھا — اور سمجھ لیجیے — کہ اس کاروبار میں ہم دونوں اچھے پارٹنر ثابت نہ ہوئے اس لیے علیحدگی اختیار کر لی۔"

"اگر آپ کا اسی دوران اصل زر پر سود لگ جاتا — تو پھر آپ کیا کرتے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ بھی مسکرا کر بولیں:

"ہاں اکثر جگہ بچے ہی والدین کے درمیان رابطہ کا باعث بن جاتے ہیں۔ کوئی ایسی صورت اگر ہوتی تو شاید ہم علیحدگی اختیار کرنے میں اتنی جلدی نہ کرتے۔ اس لیے بہتر یہی سمجھا کہ سود پڑ جانے سے قبل ہی ہم شراکت نامہ پھاڑ پھینکیں۔"

مگر ایک اور جوڑے سے پوچھا جو بڑی خوشی و خرم زندگی گزار رہا ہے کہ :

"آپ کی مسرت کا راز کیا ہے ؟"

بیوی بولیں :

"ہم نے محبت کی ہے ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیا۔"

"یعنی — ؟"

"یہ کہ — میں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ اگر ان سے میری شادی نہ ہوئی تو میں زہر پھانک لوں گی — یا — دوسری جگہ میری شادی ہوئی بھی تو اس خاوند سے بے وفائی کر کے اس کی امانت میں خیانت کرتی رہوں گی بلکہ ہمیں ایک دوسرے کی عزت و وقار اور پاکیزگی جیسے پہلے عزیز تھی اسی طرح اس کی قدر کرنے کا عہد کیا تھا۔"

میاں بولے :

"یہ بات ان کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر میں کئی بار انھیں اغوا کرنے کا ارادہ کیا کرتا تھا۔ پھر یہی خیال آتا کہ اغوا کر کے حاصل کروں گا تو دنیا کیا کہے گی ..... اس میں ہماری کتنی بدنامی ہوگی ..... اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں غیر قانونی حرکات نہ کرنا پڑیں۔"

میں نے پوچھا :

"آپ ایک دوسرے سے اکتائے نہیں ؟"

میاں نے جواب دیا :

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا — ہم ایک دوسرے کی ضرورت

بن چکے ہیں — اب دیکھیے ناں - یہ اپنے آفس جاتی ہیں، تو میں
ایک آدھ بار ٹیلیفون پر ان کی خیریت دریافت کر لیتا ہوں۔
اس سے میرا مقصد ان کی کھوج لگانا نہیں - پھر ان کا ماضی میرے
سامنے رہا ہے - جب وہ بے داغ تھا تو مجھے اپنے آپ پر —
ان پر اعتماد ہے - کہیں غلط قدم نہ اٹھے گا - ہم بیروں بیٹھے اپنے
آفس اپنے ساتھیوں اور اپنی دلچسپیوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں
یہ تھکی ہوئی ہوں تب بھی میری آسائش کا خیال رکھتی ہیں - میرے
عزیزوں کا مجھ سے زیادہ احترام کرتی ہیں اور میں ان کے ...
اور ہم دونوں اکثر خدا کا شکر ادا کرتے اور نفل پڑھتے رہتے ہیں
کہ ہم دونوں خوش قسمت ہیں افراتفری کے اس دور میں ہمارا گھر
ایک پرسکون جائے پناہ ہے جہاں ہم ایک دوسرے کے پروں
میں چونچ چھپا کر آرام کرنے والے پرندوں کی طرح ستا لیتے
ہیں اور پھر اس دنیا اور ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے
تیار ہو جاتے ہیں - اس دور میں ذہنی مطابقت کا ہونا بہت
غنیمت ہے - انسان ایک دوسرے کے اعتماد اور بھروسے
پر بُرے سے بُرے حالات سے بھی نپٹ لیتا ہے - اگر ہم
ایک دوسرے کو حالات سے ناآشنا رکھتے تو شاید ذراسی
کوفت بھی ہمیں پہاڑ نظر آتی — مگر،

الحمدللہ!

کہ ہم نے ایک دوسرے کو دھوکے میں نہیں رکھا۔
اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے!"



اکثر گھرانوں میں شادی کرتے وقت جہیز کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ میں نے اکثر خواتین کو دیکھا ہے وہ لڑکی کی صفات کو جانچنے کے بجائے یہ کھوج رکھتی ہیں کہ لڑکی کے والدین شادی کے وقت اسے ٹی۔ وی اور ریفریجریٹر وغیرہ دیں گے یا نہیں !

سونا کتنا ہوگا ؟

جوڑے کیسے کیسے ہوں گے ؟

لڑکے کو سکوٹر یا موٹر کار ملے گی یا نہیں ؟

شادی — دو افراد کے تعاون سے نئی بستی بسانے کا نام ہے۔

اس میں دیکھنا تو یہ چاہیے کہ فریقین ایک دوسرے کے دستِ تعاون بن بھی سکتے ہیں یا نہیں ؟

مگر — والدین "بستی بسانے" کے کنائے کو لے کر گھر بسانے کے جملہ لوازمات لڑکی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بستی بسانے کے لیے لڑکے کو بھی اتنا ہی حصہ لینا چاہیے بلکہ لڑکی سے بھی کہیں زیادہ۔

جب والدین اپنی لڑکی کو ضرورت سے کہیں زیادہ جہیز دے دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اسے جہیز ہی کے بل بوتے پر سسرال میں عزت کمروانا ہے۔ اگر وہ زیادہ جہیز لے کر آئے تو پھر وہ اسی

زعم میں رہتی ہے کہ میں ان لوگوں سے بہت بلند ہوں۔۔۔۔ بلکہ وہ اپنے جہیز کی اشیا صرف اپنی ذات ہی کے لیے محدود سمجھتی ہے اور نہیں چاہتی کہ سسرال کے دوسرے لوگ اسے استعمال کریں۔

اس سے یہ ہوتا ہے کہ بستی بستے بستے کئی بار اجڑتی ہے اور کئی بار رخنے پڑتے ہیں۔ کئی بار غلط فہمی کی آندھیاں سامان اڑاتی ہیں اور کئی بار آنسوؤں کے سیلاب بستی کو بہالے جاتے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ !

والدین اپنے بچوں کے نقائص، اوصاف، قابلیت، کمزوریاں، ذہانت، معیار، عمر، عادات کو سامنے رکھ کر اس کا ساتھی تلاش کریں تاکہ بعد میں ان کے بچوں کو بھٹکنا اور پریشان نہ ہونا پڑے۔ وہ کامل سکون و مسرت سے زندگی گزاریں۔ اپنے گھروں کو اپنی پناہ گاہیں سمجھیں۔ اور انھیں پوری محنت لگن اور دلچسپی سے اپنی من چاہی جنت بنا سکیں۔

ہمارے ہاں اکثر جگہ یہ خیال عام ہے کہ شادی ایک جُوا ہے اور سب کچھ تقدیر کی بات ہے۔ ماتھے کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔

مگر — :

جیسے صدقہ بہت سے مصیبتوں کو کم کر دیتا ہے،

اور —

علاج — بیماری کو کم کر دیتا ہے — اسی طرح اپنے حالات کو بہتر

بنانے اور خراب کرنے میں خود انسان کی سوجھ بوجھ کا بھی بہت حصہ ہے۔

اس لیے —

اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے
کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں کو جانچنا
پرکھنا اور سلجھانا بہت ضروری ہے!

❖

ہر عورت اور ہر مرد اپنا گھر پر سکون رکھنا چاہتا ہے۔

اور —

عورت مرد کی ضرورت ہے۔

اور —

مرد کے بغیر عورت کی زندگی تلخ —

اس لیے —

اس شدید ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ ازدواجی زندگی کو زیادہ سے زیادہ پُر سکون بنائیں۔

اس کے لیے جہاں مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو محدود نہ کرے وہاں عورت کو بھی چاہیے کہ :

وہ اپنے گھر کو جنت بنانے کے لیے بھرپور کردار ادا کرے

وہ سوچ لے کہ :

وہ خالق ہے ،

وہ ماں ہے !

اور — وہ بیوی ہے !

فرائض و ذمہ داریوں سے نپٹتے رہنا جس کی سب سے بڑی شان !

ذرا دیکھیے تو !

آپ بیوی ہیں ؟

تو آپ کا کردار کہاں فٹ آتا ہے ؟

اور —

بیویوں کے ان مسائل سے آپ کو کونسا درپیش ہے ؟

اور —

آپ نے اپنا مسئلہ کیسے نپٹایا ؟

اگر آپ اپنے حالات پر قابو رکھتی ہیں اور اپنے مسائل کے تانے بانے سے صحیح راستہ متعین کرنے کا فن جانتی ہیں ،

تو —

یقیناً آپ :

بہترین عورت ،

اور —

کامیاب بیوی ہیں !